

تعلیم و تربیت

جولائی 2014

غم زدہ مینا کے
فریاد

صفحہ نمبر: 28



WWW.PAKSOCIETY.COM

شکار



11-11-11



جولائی 2014ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

السلام عليكم ورحمة الله

[illegible]

بادشاہ نے فرمایا: ”تم لوگ کون ہو؟“ فرمائی رات کے وقت یہ بھی کیا کر رہے ہو؟“ اس کو آپ نے حاجتی و اگلاؤں کے ساتھ گردنیں ہٹا لیں اور بولے: ”اے بادشاہ سلامت! ہم رات کے ابتدائی حصے سے اپنا گم شدہ الی و محض رستے ہیں لیکن اس کا نتیجہ سراسر غمیں مل رہا۔“ بادشاہ نے سوال کیا: ”آخر کیا مال کھو گیا ہے؟“ تو فرمایا: ”ہم رات کے وقت اپنے گم شدہ مال کو پتہ نہ کر رہے ہیں۔“ بادشاہ نے حیرت سے کہا: ”اؤٹ۔۔۔؟“ بھلا ایک اؤٹ غلطی کی اس بلند مقام پر کیسے تضحیک کا باعث بن سکتی ہے؟“ انہوں نے جواب دیا: ”اگر اؤٹ اس عادت کی پست پر نہیں چڑھ سکتا تو غلطی غلطی پر رونق اٹھانے والے خدا کو کیسے اس پر تضحیک کا باعث بن سکتی ہے؟“

[illegible]

میں نے سنا تھا کہ یہ ہے کہ آپ کریں کی پٹنوں سے پوری طرف لطف اندوز ہو رہے ہوں گے کیوں کہ آپ نے پہلے سے پٹنوں کو اٹانے کی مشورہ بندی کر رکھی ہوگی جس میں کھیل کود، سیہ و فرقت دور پڑھائی وغیرہ کا باہم نہیں ملایا اور جس سے چڑھاؤ کے ساتھ وقت بھی اچھا گزرتا ہوگا۔

بہیں اس لیے ہے کہ آپ رمضان المبارک کی چار گت مساعیوں سے ہجرت، فیض یاب و روت ہوں گے۔ اسی بار کے آخری دن
سے عید الفطر منائی جائے گی۔ ہماری طرف سے خوشیوں بھری منی عید کی جتنی مبارکباد قبول کرے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی جزا دے
کہ کھوں فرماں اچھی نصیب کرنے۔ آمین!

لکھئے، اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی عقیدہ و حجاب سے آگاہ کریں۔ آپ خوش رہیں، بخدا نہیں اور آپ اور چین۔

في ان الجنا (الخريف)

۷۰۰

محمد بشیر رانی

اسمیت الیہ

عابدہ اصغر

الخبر، چلیس

ظہیر اسلام

1	اولیٰ	مہم
2	نور، نور	شیراز، شیراز
3	ابن قرآن احمد	محمد طیب الیاس
4	لیڈائی، کریمیاں	ساحل، ساحل
5	دوسری انجینئرس کول	مفتی احمد علی
6	پیشوا	پہلوان، پہلوان
10	مکانات، مکانات	
11	پڑا، پڑا	پڑا، پڑا
13	مشرقی	قرآن، قرآن
18	دار، دار	دار، دار
19	قلم، قلم	قلم، قلم
21	پلو	پلو، پلو
23	روز، روز	روز، روز
24	انجینئرس	انجینئرس
25	سری، سری	سری، سری
26	خیال، خیال	خیال، خیال
27	آپ، آپ	آپ، آپ
28	گرم، گرم	گرم، گرم
29	بچوں، بچوں	بچوں، بچوں
31	برصغور، برصغور	برصغور، برصغور
32	دوست، دوست	دوست، دوست
33	اجلا، اجلا	اجلا، اجلا
36	شرب، شرب	شرب، شرب
37	جمل، جمل	جمل، جمل
40	پہلوان، پہلوان	پہلوان، پہلوان
43	گھوڑا، گھوڑا	گھوڑا، گھوڑا
44	سری، سری	سری، سری
45	آپ، آپ	آپ، آپ
49	پہلوان، پہلوان	پہلوان، پہلوان
51	دوست، دوست	دوست، دوست
57	دوست، دوست	دوست، دوست
60	دوست، دوست	دوست، دوست
64	دوست، دوست	دوست، دوست

اور بہت سے دل چسب تراشے اور سلیے
سرہنق، علم اور مہا کی فرما

خط و کتابت کا پتہ

ایماندہ تعلیم انتہیت 32 - انجمن علمیہ اسلامیہ -

UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-38278816.

E-mail: tarbiat@gnail.com

tot tanblatts@live.com

ایم جی قمر: ظہیر اسلام

المطهر في ان سخر (براسميت) فليد الا ادر =

مجلس ١٠٠٠

اجنبی، افریقہ، یورپ (ہولڈی ڈاک سے) = 2400 روپے۔

امریکا، کینیڈا اور مغربی یورپ (برائے راک) = 2800 ہے۔

پاکستان میں (پٹرول پمپوں کی فہرست) 850ء

سُورِقِ آفِی (اورل راک سے) = 2400 روپے۔

30



اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو

حجۃ باری تعالیٰ

زمانے کی شاہی اگر چاہتے ہو
در مصطفیٰ کا گدا بن کے دیکھو
دکھوں کا مداوا اگر اموختا ہے
محمدؐ سے تم دل لگا کے تو دیکھو
کوئی بھی نہ حسرت رہے دل میں باقی
نگاہ میں مدینہ ہوا کے تو دیکھو
ہے روئے کی جالی میں آنکھوں کی ٹھنڈک
یہ لسنہ ذرا آزما کے تو دیکھو
انہی کے دوارے مٹے دور سارے
صدا یہ لگا کے ذرا تم تو دیکھو
یہ دل کی بیماری ضرور ختم ہو گی
وہ خاک شفا تم لگا کے تو دیکھو
تسیم گنبد خضرا بھی دیکھ لو گی
ارادہ ذرا یہ بنا کے تو دیکھو

یا سہج، یا قدوس، یا غفور
رحمتوں سے ہر بلا کر ہم سے دور
ناتقائ نامہوری اور نادانی میری
ہاں تیری رحمت سے میں نے پالیا ہے شعور
عزت انسان ہے تجھ کو پسند میرے خدا
میری عزت رکھ تو مولا کر دعا منظور
بحر عسیاں میں خدایا ہم ہیں سب ڈوبے ہوئے
خیر کے لسنے عطا ہوں ہم سے نہ ہوں آپ دور
اسوۂ محمد مصطفیٰؐ ہم پہ آساں بنا
اس سے رنگ لے کر بنے اپنے ملک کا دستور
ایسی آزادی خدایا پھر عطا کر دے ہمیں
جو شریعت بیعت کی ہو پابند ہر طرف حق کا ظہور
عرض کرتی ہے سراپا بن کے سائل یہ تسیم
یاد تیری ہی میں ہر دم رہوں نہ ہوں تجھ سے دور

ہمارے دل میں ہے ایک نورانی ہستی
جو ہمارے دل میں ہے ایک نورانی ہستی

سبحان اللہ تعالیٰ ہماری ہستی
سبحان اللہ تعالیٰ ہماری ہستی

نہم اختر قلم





سرزنش کی۔ ☆

ڈاکٹر فضل حسین کا خاندان بہت معزز، پڑھا لکھا اور اوضاع دار ہے۔ ان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ سدیہ بڑی بیٹی ہے۔ دادی اماں یعنی فاطمہ زہرہ ایک سلیبی ہوئی خاتون ہیں۔ ان کی بہو نفیسہ بیگم بھی بہت خوبیوں والی بہو ہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی بہت اچھی تربیت کی ہے لیکن سدیہ کے معاملے میں کچھ خاص بہتری نہیں ہوئی۔ سدیہ گھر داری سے بھاگتی ہے۔ دادی جان کہتی ہیں کہ تعلیم کے ساتھ ایک لڑکی کا فرض اور ذمے داری ہے کہ وہ گھر سنبھالنا جانتی ہو تاکہ ایک اچھے خاندان اور اچھی نسل کی بنیاد رکھ سکے۔ اب بھلا وہ بھی کیا کرتیں۔ سدیہ کسی بات پہ کان نہ دھرتی۔ بی بی اے کے امتحان کے بعد سدیہ فارغ ہوئی تو صفری بی بی نے رشتہ دکھایا۔ دادی اماں کو یہ رشتہ پسند نہیں آیا تھا اور انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہمیں بہت پیسے والے اور شیخی بگھارے والے لوگ نہیں چاہئیں۔ بیگم تنویر گو کہ دولت مند تھیں لیکن ان میں سنجیدگی نہ تھی بلکہ دنیاوی دکھاوا بہت تھا۔

"صفری بی بی اسنو ہماری بچی کسی کی امانت ہے۔ اس امانت کو کسی حق دار تک پہنچانا ہے۔ لہذا اچھے لوگوں میں بات ٹھہرائے۔" دادی جان نے صفری بی بی کو سمجھایا۔ ☆

آج اتوار کا دن ہے نہ گھر میں کچل کچل ہے۔ کچھ لوگ سدیہ

دادی اماں حسب معمول تخت پوش پر سفید چادر بچھائے بیٹھی تھیں۔ پان دان میں سے چھالہ نکالی اور کترنے لگیں۔ جب انہوں نے سدیہ کو پڑھائی میں مگن دیکھا تو بہت لکرمند ہوئیں۔ وہ سوچنے لگیں کہ یہ لڑکی پڑھ لکھ تو جائے گی مگر کل کو اس کی شادی بھی کرنی ہے لیکن گھر داری کی سمجھ بوجھ اور سلیقہ اس میں نہیں ہے۔ وہ تخت پوش سے اٹھیں اور اپنی بہو سے کہنے لگیں: "نفیسہ بیگم! ذرا سدیہ کو گھر داری کی طرف بھی مائل کر دو۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری بی بی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اپنے پھوپھو پرین کی وجہ سے سسرال میں نادم ہو۔"

"ای جان بہت کہتی ہوں لیکن اسے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔" نفیسہ بیگم نے جواب دیا۔

"سدیہ کے بی بی اے کے امتحان کے بعد صفری بی بی سے کہو اچھا سارشتہ دکھائے۔" دادی اماں نے نفیسہ بیگم کو ہدایت کی۔

"یہ کیا پکارتے ہیں اور کس نے پکایا ہے؟" محمد مرزوق نے دسترخوان پر پڑے سالن کو چکھ کر کہا۔

"سدیہ نے پکایا ہے۔" ای جان نے جواب دیا۔

اگر آپ جانتی ہیں کہ آپ کا بیٹا تندرست رہے تو برائے مہربانی ایسے کھانے سدیہ آل خودی کھائیں۔ ہم یہ آڑا نہیں۔ محمد مرزوق نے طنز کیا۔

"بیٹا دسترخوان پر کھانے میں نقش نہیں نکالتے۔" ابا جان نے

واہی جان کو بیگم نادر بہت پسند آئی تھیں۔ رمضان کی آمد آتی تھی۔ سب رمضان کی تیاریوں میں لگن تھے۔ آخر چاند رات آگئی۔ رنگ برنگے، خوب صورت لباس، چڑیاں اور مہندی۔ گھر میں خوب رونق تھی۔ نفیسہ بیگم نے گھر کو بہت سجا رکھا تھا۔

اچانک صغریٰ بی بی نے اطلاع دی کہ بیگم نادرہ ان کے ہاں آرہی ہیں۔ سب بہت حیران تھے کہ یوں اچانک ان کا آنا۔؟؟ خیران کے لیے چائے کا انتظام کیا گیا۔ باہر "چاند نظر آگیا" کا شور مچا۔ سب ایک دوسرے کو مہاک باد دینے لگے۔ سدیسہ اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی تھی۔ اچانک دھڑ سے دروازہ کھلا۔ بیگم نادرہ اور ان کی بیٹی اندر داخل ہوئیں۔ ساتھ ہی گھر کے تمام افراد بھی اندر آ گئے۔ سدیسہ نے جلدی سے سر پر دوپٹہ اور حادہ سنہیل کر بیٹھ گئی۔ بیگم نادرہ نے پرس میں سے ایک چمکتی دکنی انگلی لکالی اور سدیسہ سے چھوٹی خدامہ کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ سدیسہ اور سب گھروالوں کو ایک دھچکا سا لگا۔ یعنی بیگم نادرہ نے خدامہ کو پسند کر لیا تھا۔ بیگم نادرہ نے خدامہ کے کان میں کچھ کہا۔ "کیسی لگی انگلی؟" "بہت پیاری، آنٹی جان!" "اچھا ایسا کرو، تم یہ انگلی سدیسہ کو دکھاؤ۔" سب ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

بیگم نادرہ نے سب کو ایک خوش گوار حیرت سے دوچار کیا تھا۔ "بیگم فاطمہ! سدیسہ کو تو میں نے پہلے ہی دن سے پسند کر لیا تھا۔ میں جان گئی تھی کہ آپ لوگوں کی بیٹی بہت قابل اور نیک ہے۔ اگر کی تھی تو گھر داری سے نادانیت کی۔ میں ایک اچھی زراعت کا آغاز کروں گی۔ لڑکی کو ایک جابی کی وجہ سے ٹھکرا دینے سے بہتر ہے کہ اس کی شخصیت کو بہتر بنادیا جائے۔ میں مرزوق کی صاف گوئی پر بہت خوش ہوں، اس کے ایک بچہ نے ہمیں ایک سکھر بننے سے نوازا دیا ہے۔ میرا کان میں کوئلہ ہی تو ہوتا ہے۔ تراش خراش سے ہی اس میں چمک آتی ہے۔ ہماری سدیسہ بھی میرا ہے۔ میں ایسی ہی ہو چاہتی ہوں جو تعلیم یافتہ دین دار اور سکھر ہوتا کہ میری اگلی نسلیں سنو جائیں۔ ہم اولاد کی تربیت کے بارے میں خدا کے جواب دہ ہیں۔" بیگم نادرہ نے سدیسہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"میری پیاری بہنیا، بننے کی دہنیا۔" مرزوق نے سدیسہ کو پھیرا۔ سدیسہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اس کا دل خوشیوں سے بھر گیا تھا۔ یہ عید اس کے لیے دوہری خوشیاں لائی تھی۔ وہ مرزوق کی شکر گزار تھی۔ انگلی کی چمک دکھ اس کے چہرے پر عید کی خوشیوں کو دوبالا کر رہی تھی۔

گودیکھنے آرہے ہیں۔ نفیسہ بیگم نے درپہر کے کھانے کا اہتمام کر رکھا ہے۔ سدیسہ نے بے دلی سے ایک اچھا سا سوٹ لگا لیا، بال سنوارے اور اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔

بیگم نادرہ خاتون، اپنی بیٹی کے ساتھ فضل حسین کے گھر پہنچیں تو ان کی شربت سے تواضع کی گئی۔ کچھ دیر بعد دوپہر کا کھانا لگا دیا گیا۔ سب لوگ ہنر خوان پر بیٹھ گئے۔ بیگم نادرہ کو کھانا شروع کرنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے بریالی اپنی پلیٹ میں نکالی اور ایک چمک منہ میں ڈالا۔ "اوندہ بہت مزے کی بریالی ہے۔ کس نے بنائی ہے؟" "نہ۔۔۔۔۔۔ یہ ہماری سدیسہ نے بنائی ہے۔" نفیسہ بیگم نے جھٹ سے جواب دیا۔

محمد مرزوق نے سر اٹھایا، سب کے چہروں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "آئی! یہ بریالی امی جان نے بنائی ہے۔" نفیسہ بیگم ایک دم بوکھلا گئیں اور آنکھیں چرا لگیں۔ بیگم نادرہ جلد ہی صورت حال پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔ "خیر ایک ہی بات ہے۔ ناں کے ہاتھ میں ذائقہ ہے تو سدیسہ کے ہاتھ میں بھی ایسا ذائقہ ضرور ہوگا۔"

نفیسہ بیگم نے سکھ کا سانس لیا۔ اب سب مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ بیگم نادرہ نے سدیسہ سے چھوٹی خدامہ کو پیار کیا اور رخصت کی اجازت مانگی۔

بہت دن گزر گئے لیکن ان کی طرف سے کوئی حوصلہ افزاء جواب نہ آیا۔

"محمد مرزوق تم نے کیا کیا؟ شرم کرو تمہاری بہن کی بات بنے جاری تھی، تم نے اچھا نہیں کیا۔" نفیسہ بیگم مرزوق سے مخاطب تھیں۔ "امی جان! فکر امت کریں۔ آپ کی زندگی کی بنیاد جھوٹ پر مت رکھیں۔ یہ آپ کی ساتھ زیادتی ہوگی۔ یقین کریں آپ کی نظر میں جو بڑا ہوا زہ ایک اچھے کام کے لیے ہوا ہے۔"

سدیسہ بھی روکیے جانے پر بہت افسردہ تھی۔ اسے احساس ہونے لگا کہ ایک بیٹی کے کیا فراموش ہیں۔ اس کی شخصیت افسردہ تھی۔ اس نے اپنی شخصیت کے خلا کو پُر کیا۔ کھانا لگانے اور گھر داری میں دن جیسی لینے لگی لیکن اس کا دل پر مہرود تھا۔ ایک بے نام سی اداسی اس میں گھر کر گئی تھی۔

"ہماری پیاری بہنیا، بننے کی دہنیا۔" مرزوق اس کے سر پر چپٹ لگا کر اسے پھیرتا تو وہ پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیتی۔ وہ مرزوق سے مخاطب تھی۔ اس نے سچ بولی کہ اسے شرمندہ کر دیا تھا۔



کو دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اس بچے کی عمر کوئی پانچ چھ سال ہوگی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا بڑا سا شاپر تھا اور وہ کوزے کے ڈھیر پر جھکا ہوا تھا۔ پہلے تو دل میں آیا کہ چھوڑ دو..... ہوگا کوئی..... مگر پھر دماغ نے دل کے اس خیال کو رد کر دیا کہ اگر کوئی ردی اٹھانے والا ہے تو اتنی سویرے اس کو آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کسی انہولے خدشے کے پیش نظر میں ایک طرف ہو کر اس بچے کی حرکات و سکنات کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ بچہ اٹھا اور اس کا منہ میری طرف ہوا تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ میں نے جلدی سے آنکھوں کو مسلا کہ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا مگر یہ تو بالکل حقیقت تھی، ناقابل یقین حقیقت.....! اس بچے کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ ہمارے پچھلے محلے میں رہنے والے شوکت صاحب کا بیٹا تھا۔ وہ اچھے کھاتے پیتے گھڑائے سے تعلق رکھتے تھے۔ مال کی فراوانی کے باوجود وہ کافی سلیجے ہوئے انسان تھے مگر ان کے بیٹے کو اس حال میں دیکھ کر میں حیران و پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پہلے تو دل میں آیا کہ اس سے جا کر پوچھ لوں کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے مگر پھر اپنے اس ارادے کو عملی

اس رات شدید بارش ہوئی اور جب بھی ایسی بارش ہوتی تو مجھی کے کچھ ہونے کی وجہ سے پانی ٹھہر جاتا۔ کوئی بھی بغیر پھسلے نہ رہتا اور اندھیرے میں چلنا تو تقریباً ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس رات بھی ایسی ہی شدید طوفانی بارش ہوئی تھی۔ رات کو میں نماز کے بعد فوراً سو گیا۔ رات گئے تک بارش ہوتی رہی۔ فجر کی اذان پر آنکھ تو کھل گئی مگر رات ہونے والی بارش کی وجہ سے طبیعت میں بستی چھائی ہوئی تھی۔ دل میں آیا کہ اتنی کچھڑ میں مسجد میں جانا تو مشکل ہے۔ جب نماز گھر ہی میں پڑھنی ہے تو کیوں نہ تھوڑی دیر اور سو لیا جائے، پھر ٹھہر کر پڑھ لوں گا۔ یہ سوچ کر میں نے کروٹ بدلی اور چادر تان کر سو گیا۔

”فرتھن بیٹا! نماز کا وقت ہو گیا ہے، ابھی سوئے ہوئے ہو۔؟“ چم لینے ہی گزرے تھے کہ ابو جان کی آواز کانوں سے گرائی، اب تو اٹھنا ہی تھا۔ وضو کیا اور مسجد کی راہ لی۔ ابو جان پہلے ہی مسجد جا چکے تھے۔ نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد جیسے ہی گھر کی طرف چلا تو گلی کی بکڑ پر جہاں عام طور پر مجھے والے اپنے گھروں کا کوزا ڈال دیا کرتے تھے اور بعد میں ٹی ایم اے والے اٹھا کر لے جاتے تھے، اتنی صبح سویرے ایک بچے

ہوئے اس سے پوچھا۔ "یہ تم کہاں لے کر جا رہے تھے؟"
 "وہ..... انکل..... میرے ابو نے کہا تھا کہ اس کو محلے کے
 باہر جو کوڑا کرکٹ کی جگہ ہے، وہاں ڈال کر آؤ.....!"

"مگر تم اس کو اپنے محلے والے کوڑے دان میں بھی تو ڈال
 سکتے تھے، لی ایم اے والے اٹھا لیتے..... جہیں اتنی صبح سویرے
 وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی اتنے کچھڑ میں۔"

"انکل! دراصل بات یہ ہے کہ رات کو ابو ہمارے لیے
 اخروٹ اور چٹنوز لائے تھے۔ ان کو کھانے کے بعد ابو نے مجھے
 کہا کہ ان چٹنوز کو باہر نہ پھینکا بلکہ کسی شاہر میں ڈال کر صبح
 سویرے نماز کے فوراً بعد محلے سے باہر والے کوڑے کے ذریعہ پر
 ڈال آنا، کیوں کہ یہ میوے کافی مہنگے ہیں۔ ہر ایک کے بس میں
 نہیں کہ ان کو خرید سکے۔ اب اگر ان کے چٹکے اصرر گلی میں ہی
 پھینک دیے تو کسی کی دل آزاری ہو سکتی ہے۔ دیکھنے والے کے
 دل میں یہ بات آسکتی ہے کہ کاش! ہمارے پاس بھی اتنے پیسے
 ہوتے تو ہم بھی یہ میوے کھاتے یا کوئی بچہ دیکھے گا تو وہ اپنے ماں
 باپ کو جا کر شک کرے گا کہ ہمیں بھی لے کر دو۔ دسکتا ہے اس
 بچے کے ماں باپ کے پاس اتنی طاقت نہ ہو تو اس سے ان کا دل
 رکھے گا۔ یہ دل آزاری ہے اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے کسی
 کی دل آزاری کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔" وہ بولتا جا رہا تھا
 اور میں حیرت کا نبت بنا اس کی باتوں کو سن رہا تھا۔ مجھے مکمل توجہ
 سے سنتا ہوا کہ اس کو مزید کہنے کی جرأت ہوئی تو وہ کہنے لگا۔ "انکل!
 راستے میں ایک جگہ اور مجھے چٹکے ملے تھے وہ بھی میں نے اس شاہر
 میں ڈال لیے ہیں تاکہ ان پر بھی کسی کی نظر نہ پڑے۔ ان کی وجہ
 سے بھی کوئی دیکھی نہ ہو۔ انکل! جب ہم کسی کو دکھ نہیں دیں گے تو
 اللہ تعالیٰ اور ہمارے نبی ﷺ ہم سے خوش ہو جائیں گے۔" وہ
 مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میرا تو سر شرم سے جھکا جا رہا تھا کیوں
 کہ راستے میں سے اٹھائے جانے والے جن چٹنوز کا وہ کہہ رہا تھا۔
 وہ وہی چٹکے تھے جو میں نے رات کو چھینکے تھے۔ اس کے عمل نے
 میری آنکھیں کھول دیں تھیں۔ میں نے کسی کا دل نہ دکھانے کا اور
 سنت پر عمل کرنے کا عزم مصمم کر لیا تھا۔

بہانہ پہنانے کی بجائے میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ دیکھتے ہیں کہ وہ
 کرے کیا ہے۔ تموزی دیر تو وہاں جھکا رہا، پھر سیدھا کھڑا ہوا اور
 شاہر اٹھائے ہمارے گھر کی طرف آنے لگا۔ میں ایک اوٹ میں دو
 گیا۔ اتنے میں وہ شاہر اٹھائے، ہمارے گھر سے آگے گزر گیا۔
 اس کے گزرتے ہی میں نے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا پیچھا کرنا
 شروع کر دیا۔ اس کی پال میں تیزی تو تھی مگر ایسے لگتا تھا کہ شاہر
 کوئی دزدنی ہے جس کے اٹھانے میں اسے کافی وقت ہو رہا ہے۔
 میں چپکے چپکے اس کے پیچھے چتا رہا۔ تموزی زور جا کر بھی "دوڑو" نہ
 اور میں بڑی احتیاط سے اپنا دھا تھا۔ ایک تو گلی پانی سے بھری
 ہوئی تھی اور دوسرا میری یہ کوشش تھی کہ اس بچے کو پتا نہ چلے کہ اس
 کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ میری لاکھ احتیاط کے باوجود بھی قلی کا سوز
 مڑتے ہی میرا ہر اچانک ایک کھدے میں جا پڑا اور چھپاک کی
 آواز سے میرا ہر اس کھدے میں اترتا چلا گیا۔ کھڈا لگتا تھا کافی
 گہرا تھا۔ نہ تو یہ ہوا کہ وہ بچہ بھی اچانک اس آواز پر چونک کر مڑا
 اور مجھے دیکھ کر اس نے اپنے قدم اور تیز کر دیے۔ "ڈک
 جاؤ۔" میری تیز آواز گونجی تو اس کے ہر نوہیں ڈک گئے، گویا
 زمین نے اس کے پیروں کو جکڑ لیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے
 اپنے آپ کو اس کھدے سے نکالا اور اس کے قریب جا کر سخت
 آواز میں پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو اور اس شاہر میں کیا ہے.....؟
 شاہر کا نام سننے ہی اس نے شاہر کا منہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ گویا وہ
 شاہر مجھے نہیں دکھانا چاہتا تھا اور اس کی یہ حرکت مجھ سے چھپی نہ رہ
 سکی۔ "شاہر مجھے دہا۔" میرے کہنے پر ایک بار تو اس نے شاہر
 رہے ہاتھ میں کر لیا مگر جب اس نے دیکھا کہ میں ملنے والا
 نہیں ہوں تو اس نے شاہر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اس
 سے اس شاہر کو چھینا اور جب اس کو کھولا تو میرا غصہ دوچند ہو گیا۔
 ایک تو مجھے اپنے گرنے کا غصہ تھا، اور اسے شاہر میں موجود
 اخروٹوں اور دوسرے میوہ جات کے چٹکے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔
 گویا وہ بچہ ان چٹنوز سمیت میرا منہ چڑا رہے تھے۔ میں تو کوئی
 کاروبار سرانجام دینے کا سوچ رہا تھا مگر یہ تو لینے کے دینے پڑ
 گئے۔ میں نے اپنی غصت کو چھپانے کے لیے غصے پر قابو پاتے



بہان کرنا پڑتا ہے۔ اس پر بات چیت کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔
 احمر کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بڑے بھائی سے بات
 کرے، وہ بہت دن تک الجھا الجھا سا رہا۔ سہیلہ کا تقاضا بڑھتا
 گیا۔ اسد نے محسوس کیا کہ احمر کسی الجھن کا شکار ہے۔ اس نے
 پوچھ ہی لیا۔ احمر نے پہلے تو چھپانے اور ٹالنے کی کوشش کی مگر اسد
 نے اسے اپنی اولاد کی طرح پال تھا۔ اسد نے اٹھوایا لیا اور پھر وہ
 احمر کی پریشانی اور الجھن جان کر خود بھی پریشان ہو گیا۔ اس بارے
 میں تو اسد نے اتنی سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے سہیلہ کی خود غرض سوچ
 پر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا مگر وہ ایک سمجھ دار انسان تھا۔
 اس نے حقیقت تسلیم کر لی اور احمر کو اتوار کا امت دیا کہ وہ اس وقت
 تک تمام حساب کتاب کر کے اس کی خواہش پوری کر دے گا۔
 احمر کو بھائی سے بات کر کے بعد دیکھ سا محسوس ہوا۔ اسد نے اس
 کے مستقبل کی خاطر اپنی بہت سیاری خوشبینی کو قربان کیا تھا۔ وہ
 ایک بہتر مستقبل حاصل کر چکا تھا اور یہ ابتداء تھی۔ اس کے برعکس
 اسد کی مالی حالت خراب تھی۔ اسٹور میں کچھ پارٹنر بھی تھے۔ آج
 مکان کافی خستہ ہو چکا تھا جس کو بہتر کرنے پر بہت خرچہ آ رہا تھا
 اور شاید اسد یہ کر نہیں پا رہا تھا۔

احمر نے ہفتے کی رات اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں بہت
 سوچا۔ جب وہ صرف بارہ سال کا تھا تو اسد نے شادی کر لی مگر اپنی

اسد اور احمر وہ بھائی تھے۔ اسد کی عمر اٹھارہ سال تھی جب کہ احمر
 کی عمر آٹھ سال تھی۔ ان کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا
 تھا۔ والد تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے جب کہ والد نے اسپتال جا
 کر دم توڑ دیا۔ مرتے وقت ان کے والد نے اپنے بڑے بیٹے اسد کو احمر
 کے متعلق کچھ نصیحتیں اور وصیت بھی کی۔ باپ کے انتقال کے بعد اسد
 نے ایک ذمہ دار بڑے بھائی کا کردار ادا کیا۔ اس نے نہ صرف اپنے
 والد کا کاروبار یعنی جنرل اسٹور کو سنبھالا بلکہ خراب پرورش بھی احمر
 طریقے سے کی اور اس ذمہ داری کو اچھے طریقے سے نبھایا۔

احمر پڑھ لکھ کر آئی ٹی انجینئر بن گیا اور اسے ایک بہت اچھی
 نوکری مل گئی۔ اسد شادی کر چکا تھا۔ اس کی بیوی بھی احمر کا بہت
 خیال رکھتی تھی۔ اسد کو جب نوکری مل گئی تو اسد اور اس کی بیوی نے
 باہمی مشورے سے احمر کی بھی شادی کرادی۔ شادی کے کچھ عرصے
 بعد احمر کی بیوی سہیلہ نے احمر سے کہا کہ وہ گھر میں اپنی پوزیشن کلیئر
 کرے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ گھر اور سبزی کی اسٹور میں احمر کا
 کتنا حصہ ہے اور ہمارے اسی صورت میں انہیں کتنی رقم مل سکتی ہے۔
 احمر کو پہلی بار اپنی بیوی کی کوئی بات بُری لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں
 سکتا تھا کہ اسے اسد بھائی سے الگ ہونا پڑے گا یا وہ ان سے اپنے
 حصے کی بابت دریافت کرے گا۔ وہ سہیلہ سے روٹھ رہا مگر سہیلہ ایک
 چالاک عورت تھی، اس نے احمر کو رام کر لیا اور سمجھایا کہ آخر سب کو

فیصلہ کو قبول کر لیا کیوں کہ بحث و مباحثہ کا وقت نہ تھا۔ نئے یہ فیصلہ قبول نہیں تھا اور اس کا وجہ یہ تھی کہ نئے امر سے پیار تھا۔ یہ بہت چھوٹی عمر میں ابو کے پیار سے محروم ہو گیا۔ یہ ایک مظالم بچہ تھا۔

اسد کی آواز بھڑا گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روکا اور پھر بولا۔ "بھلا بھائیوں کے درمیان بھی لین دین با سووے بازی ہوتی ہے۔ میں نے امر کے لیے جو کچھ کیا، اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ اسٹور کے مالی معاملات آج بھی وہی ہیں کہ ہمارا حصہ دس لاکھ کا ہے اور اسٹور کا قرض بھی دس لاکھ کا ہے۔ البتہ یہ مکان آج چالیس لاکھ کا ہے۔ انصوائن مکان کو دو حصوں میں تقسیم ہونا چاہیے مگر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ مکان میں امر کے نام کر دوں گا۔ اگلے چار پانچ سال تک علیہ اور اصغر اپنی تعلیم مکمل کر لیں گے۔ وہ اپنی زندگی خود بنالیں گے۔ مجھے اپنے بچوں سے ویسی ہی امیدیں وابستہ ہیں جیسی امر سے تھیں۔ امید ہے یہ بھی امر کی طرح میری توقعات پر پورا اتریں گے۔"

اسد یہ کہہ کر چپ ہوا تو ڈرائنگ روم میں سانا چھا گیا۔ امر نے عجیب سی نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے لالچ نے اسے عجیب موڈ پر لا کھڑا کیا تھا۔ اسد یہ فیصلہ کرے گا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اسد نے فائل اٹھا کر امر کو دی اور بولا۔ "میں نے قانونی کاغذات تیار کر دیا لیے ہیں۔ اب یہ مکان امر کا ہے۔"

سیلہ کے لیے بھی یہ صورت حال غیر متوقع تھی مگر اسے یہ فیصلہ قبول تھا اور پسند بھی آیا تھا۔ وہ ایک لالچی عورت تھی۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

امر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اسد کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا کر بولا۔ "بھائی! مجھے معاف کر دیں۔ مجھے بڑا رنج نہیں چاہیے۔ مجھے یہ مکان نہیں چاہیے۔ یہ مکان علیہ اور اصغر کے نام کر دیں۔ یہ بھی میرے بچوں کی طرح ہیں۔"

اسد نے نظر بھر کر امر کی طرف دیکھا، پھر غریبہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا مگر اسے آنسوؤں پر قابو نہ پاسکا۔ امر اسد کے ہاتھ لگ گیا۔ چند لمحوں کے آنسوؤں میں برسوں کا غم نکل گیا۔ بڑا رنج معطل ہو گیا۔ بدگمانی اور لالچ کی بار ہو گئی، محبت جیت گئی۔

اولاد ہو جانے کے بعد بھی اسد کا امر سے پر شفقت رویہ تبدیل نہ ہوا۔ پہلی مرتبہ اس کی بہترین تعلیم کے لیے اسد نے اپنے اسٹور کے آدھے مالکانہ حقوق فروخت کیے۔ پھر اس کے بعد اس نے کیسے امر کی مہنگی تعلیم کے لیے وسائل مہیا کیے، یہ صرف وہی جانتا تھا۔ ایک مرتبہ بھابی نے اسد کی توجہ بڑھتے ہوئے قرض کی طرف دلائی تو اسد نے یہ جواب دیا تھا کہ امر میرا خواب ہے، میرا سب کچھ امر کا ہے۔

یہ بات امر نے سنی تھی مگر اس وقت اس نے پرواہ نہ کی تھی لیکن اب اسے یہ بات یاد آئی تو وہ تڑپ کر رہ گیا۔

ایک کے بعد ایک نیکی..... قربانی..... اور اب ہمارے واقعات نظروں کے سامنے گزرنے لگے۔ اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔ وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند تو جیسے اس سے روٹھ گئی تھی اور پھر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا اور جب صبح نمودار ہو رہی تھی اور لوگ بیدار ہو رہے تھے تو اس کی آنکھ لگ گئی۔

اتوار کا دن آ گیا۔ امر، سیلہ کو لے کر اپنے بھائی کے گھر پہنچا تو سب کچھ بہت خوش گوار تھا حالانکہ وہ توقع کر رہا تھا کہ کچھ تناؤ اور ناراضی کی کیفیت ہوگی مگر بھابی تک کا رویہ نارمل تھا۔ اسد کے بچوں نے پہلے کی طرح امر کو سلام کیا اور اس سے لپٹ گئے۔ بھابی نے ہمیشہ کی طرح آج بھی شان دار کھانا تیار کیا تھا، لگ ہی نہیں رہا تھا کہ آج کوئی ناپسندیدہ فیصلہ ہونے جا رہا ہے۔ کھانے کے بعد اسد ایک فائل لے کر آیا۔ فائل میز پر رکھ کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ امر نے دیکھا کہ وہ تھکا تھکا اور پڑھرہ لگ رہا ہے۔ حالات کے جبر نے اسے دلت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ اسد نے بغیر کسی تمہید کے فائل کھولی اور آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "جب امی ابو کا انتقال ہوا تو اسٹور پر پانچ لاکھ کا قرضہ تھا۔ اس مکان کی قیمت اس وقت چار لاکھ تھی۔ اسٹور کی مالیت قرض سمیت پانچ لاکھ تھی۔ اس طرح تمہاری وراثت چار لاکھ روپے تک محدود تھی۔ ابو جی نے وصیت کی تھی کہ مکان میں لے لوں اور دو لاکھ روپے امر کی تعلیم و تربیت پر خرچ کروں۔" اسد سانس لینے کے لیے رکا تو سیلہ نے معنی خیز نظروں سے امر کی طرف دیکھا۔ اسے یہ ساری باتیں جھوٹ اور جاسیداد ہتھیانے کا ڈراما لگ رہی تھیں۔

اسد ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ "میں نے اس وقت ابو جی کے



- امریکہ نے ریاست ہائے متحدہ سے 72 لاکھ ڈالر کی رقم دی تھی۔
- روم کے بادشاہ کبریا نے ایک ہزار اکتیس چھپکن لڑکیاں اور تمام میں کام لایا حاصل کی۔
- پاکستان کی 1400 کھوئے ہوئے افراد کو مستحق سے ملے۔
- دہشت گردی کا آلہ کار سیکرٹریٹ نے ایجاد کیا۔
- تان سین کے استاد کا ام ہرنی دان تھا۔
- سابق بیوی ویت ہاکنگ چھپکن ہیکنگ کوئی سن 1993 کو اسلام قبول کیا۔ (اسحاق کرانی)
- ارنی میریا میں 70 فی صد سٹائن ہیں۔
- ارنی میریا کا صدر مقام اسلام ہے۔
- ترک عثمانی سلطنت نے ارنی میریا کو 1557 میں اسلامی برادری میں شامل کیا۔
- ارنی میریا کی آبادی 10 لاکھ ہے۔
- ارنی میریا پر 328 سال تک اسلامی پرچم لہرایا۔
- برطانیہ نے ارنی میریا پر 1941 میں قبضہ کیا۔
- ارنی میریا کا رقبہ 47876 مربع میل ہے۔
- ارنی میریا میں 1993 میں آزاد ہوا۔ (مکمل لکچر)
- دیوار چھپکن کے بعد دنیا کی دوسری طویل ترین دیوار، دیوار ہندوستان ہے جس کی لمبائی 74.5 میل ہے۔
- بھلوں اور بھیلوں کی صنعت کو کارپوریٹ بنایا گیا ہے۔
- ہندوستان کی زبان کا لکچر ہے جس کے 'ہی' ہیں برف کا بھی۔
- کمبوڈیا دنیا کا واحد ملک ہے جہاں انسانی وحشیانہ کی تجارت وسیع پیمانے پر ہوتی ہے۔
- مصنوعی بالوں کا فیشن یورپ میں انیسویں صدی میں شروع ہوا۔
- ناسٹورس والی ناچس فرانس میں ایجاد ہوئی تھی۔
- ایک پونڈ میں 454 گرام ہوتے ہیں۔
- بدھ مت کا مذہب رنگ پیا ہے۔
- دنیا کی سب سے بڑی گھنٹی ماسکو (روس) میں ہے۔
- دنیا میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ملک سویڈن ہے۔
- ایشیا میں چھپنے پانی کی سب سے بڑی نہیل ویر ہے جو تقریباً 2500 سال قبل بنی تھی۔
- کشمیر میں دریائے جہلم کے کنارے سوہاگ اور بانڈی پور کے درمیان واقع ہے۔ (ام فراد پھیل)
- دنیا کے بلند ترین میناروں والی مسجد کاسا ہلالا میں ساحل ہندوستان پر واقع ہے۔
- دنیا میں بلند ترین میناروں والی مسجد کا افتتاح اگست 1993 میں مراکش کے شاہ حسن ثانی نے کیا تھا۔
- دنیا میں بلند ترین میناروں والی مسجد سوہاگ کی بلندی تک ہے۔
- کاسا ہلالا میں واقع دنیا کی بلند ترین میناروں والی مسجد کے ہال میں 25 ہزار آدمی جن میں 80 ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے۔
- کاسا ہلالا میں واقع دنیا کی بلند ترین میناروں والی مسجد کو نمازیوں کے لیے 4 فروری 1994 کو کھولا گیا تھا۔ (دہشت گردی گمراہ)
- سعودیہ کے اخبار 'النور سنار' نے سعودی عرب کے بادشاہ شاہ فہد کو 'دل کا بادشاہ' کا خطاب دیا کیوں کہ سال 1995 میں شاہ فہد نے ایک چار سالہ بچی کے علاج کے لیے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈ یعنی تقریباً ستر لاکھ روپے عطیہ دیے تھے۔
- سعودی عرب کا قومی دن 23 ستمبر کو ہوتا ہے۔
- دنیا بھر میں انسانی لوعیت کا پہلا 'جوڑوں کا میوزیم' کیلیڈا کے شہر نورٹون میں قائم کیا گیا ہے۔
- کیلیڈا کے شہر نورٹون میں قائم 'جوڑوں کا میوزیم' چھ مئی 1995 کو عوام کے لیے باقاعدہ طور پر کھول دیا گیا تھا۔
- پاکستان میں پہلی مرتبہ اگست 1995ء میں جلوسٹری پارک لاہور میں شہر میں کے چار انڈوں سے بچے پیدا ہوئے تھے۔
- دنیا میں سب سے زیادہ تیل نکالنے والے دہشت گرد اسلامی ملک کویت میں ہیں۔ (شہزادہ لاہور)

راشد علی نواب شاہی



پیارے اللہ کے پیارے نام

آکھ رانج

الزُّوْفُ جَلُّ جَلَالُهُ (بیت پروردگار)

حقیق، سلمان اور بہزاد تینوں آج شہر سے دریا کے کنارے کے دوسری طرف جنگل میں فاختاؤں اور پرندوں کا شکار کرنے کے لیے نکلے ہوئے تھے، تینوں کے پاس ارگن تھی۔

ساڑھے تین گھنٹے میں اب تک وہ تیرہ فاختائیں اور پانچ جنگلی کبوتروں کا شکار کر چکے تھے۔ وہ سارے ذبح کر کے انہوں نے ایک پلاسٹک کے تھیلے میں رکھ دیئے تھے۔

”حقیق! میرا خیال ہے اب بس کریں۔“ سلمان نے کہا۔
”اے دوست! کھانک گئے ہیں، ابھی بیٹھ کر کھانا کھا لیتے ہیں۔“ بہزاد نے بھی کہا۔

تینوں دوست ایک کسے درخت کے نیچے کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ تینوں نے اپنے اپنے گھر کا کھانا اور پانی کی بھری بوتلیں دسترخوان پر رکھیں اور کھانے لگے۔

حقیق اپنے گھر سے جو سالن لایا تھا وہ بکس سبزیاں تھیں۔ بہت ساری سبزیاں اکٹھی بنائی گئی تھیں اور اس میں مرغی کا گوشت بھی تھا۔

الزُّوْفُ جَلُّ جَلَالُهُ وہ ہے جو اپنے بندوں پر آسانی اور مہربانی کا معاملہ کرنے والا ہے۔

یہ مبارک نام قرآن کریم میں دس مرتبہ آیا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ آپ بھی پڑھیں۔

”اللہ تعالیٰ تم پر نری کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔“
اس اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور ساری مخلوق کے ساتھ بڑی آسانی اور مہربانی والا معاملہ کیا ہے، جس کی ایک مثال یہ ہے کہ جتنی مخلوق ہے تو اس کے ماحول کے اعتبار سے ویسی ہی کھال بنائی تاکہ وہ سردی گرمی سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔

یہ اسی کی مہربانی ہے کہ رات کو دن میں تبدیل کیا۔ اگر ہمیشہ رات ہی رہے تو دن میں کام کاج کیسے کرتے؟ ہم کیسے پڑھتے اور کیسے لکھتے؟

یہ جتنے جانور ہیں یہ انسانوں کے کیسے قابو میں ہیں جس سے وہ ان جانوروں سے کام لیتے ہیں۔ یہ بھی اسی کی مہربانی ہے۔ اس طرح جہاں بیماری پیدا کی، وہاں اس کی دوا بھی پیدا کی ہے۔



مسٹر ابو اپنے گھر کے کمرے میں لکڑی کی بنی کرسی پہ بیٹھے، کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ ان کے ارد گرد بہت سی سیلف اور الماریاں تھیں جن میں کتابیں ہی کتابیں تھیں جو ایک ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ مختلف سیلف میں مختلف قسم اور رنگوں کے کاغذ بھی ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ مسٹر ابو کے پاس بہت خوب صورت ماسٹری ہڈ تھا جس سے وہ لکھتے تھے۔ ویسے تو ان کے پاس خطے میں طے ہوئے کئی قلم تھے مگر وہ ذاتی طور پہ اسی سبزی ہڈ سے لکھتا پسند کرتے تھے۔ مسٹر ابو یہ کام کئی سالوں سے بنا تھکے، بنا کے کر رہے تھے۔ انہیں اپنے کام سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ اگر کبھی تھک بھی جاتے تو کرسی کی پشت سے یک لگا کر کچھ دیر کے لیے سو جاتے۔

مسٹر ابو کے پاس دنیا جہاں سے بچے آتے تھے اور ان کو مخاطب کر کے اپنے پسند کے کاغذ پہ اپنی ڈھیر ساری خواہشات یا خواب لکھواتے تھے جنہیں مسٹر ابو بہت شوق اور دل چسپی سے لکھتے اور اپنے گھر کے باہر پرانے سے لیٹر ہاکس میں ڈال دیتے تھے۔ مسٹر ابو کا یقین اور اعتقاد تھا کہ آسمان سے فرشتے اترتے ہیں اور انہیں کی

ایک بہت خوب صورت، سرسبز دادی تھی اور اسی دادی میں ایک بہت اونچا، آسمان کو چھوتا ہوا پہاڑ تھا۔ اسی پہاڑ کی چوٹی پہ ایک تین کونوں والا بہت پرانا گھر بنا ہوا تھا۔ باہر سے وہ گھر مثلث کی طرح نظر آتا تھا جس کی چوٹی سے ہلکا ہلکا دھواں نکلتا رہتا تھا۔

اس گھر تک آنے کے لیے ایک پہاڑی راستہ بھی موجود تھا جو کافی ٹیڑھا ہونے کے ساتھ ساتھ اونچا نیچا بھی تھا اور اس گھر میں رہنے والے مکین کا نام جس سے لوگ اسے جانتے اور پکارتے تھے ”مسٹر ابو“ تھا اس کا اصلی نام کیا تھا اور مختصر ہو کر ”ابو“ کیسے بن گیا تھا، اس کے بارے میں ٹھیک سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کسی کو دل چسپی تھی۔ ان کے لیے وہ ”مسٹر ابو“ ہی تھے۔

مسٹر ابو کی عمر لگ بھگ 100 سال کے قریب تھی اور ان کا مخصوص لباس آسمانی یا پھر سرسبز رنگ کا پاؤں تک آتا گاؤں تھا۔ سر پہ اسی رنگ کی ٹکونی ٹوپی اور آنکھوں پہ تارک سی سبزی فریم کی عینک، جس کی چین گلے میں لگی ہوئی ہوتی تھی اور پیٹے تک آتی۔ ان کی سفید داڑھی بہت لمبی لگتی تھی۔ مسٹر ابو بہت مہربان اور شفیق انسان تھے جن کا کام چوبیس گھنٹے بس لکھنے کا ہی ہوتا تھا۔

ہوں۔ چاہیں آپ بھول کیوں جاتے ہیں۔" ننھی کیٹ نے منہ بناتے ہوئے کہا اور شیشے کے مرتبان میں سے، نفاست سے کینڈی نکال کر کھانے لگی۔

"او کے مس کیٹ! جیسا آپ پسند کریں۔" مسٹر ابو نے کہا اور اٹھ کر گلابی رنگ کے نقیس سے سادہ کاغذ نکال کر لے آئے۔ اس دوران کیٹ انہیں دیکھتی رہی۔

"جی بولے مس کیٹ کیا لکھوں؟" مسٹر ابو نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔ کیٹ نے بہت انداز سے اپنے سنہری بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اپنی خواہشات لکھوائی مگر جسے سن کر مسٹر ابو مسکرا دیے اور سنہرے ہڈ سے کاغذ پر منسل کرتے گئے۔

"مس کیٹ! آپ کی خواہشات کافی بڑی بڑی ہوتی ہیں۔" مسٹر ابو نے جب کیٹ کی بتائی ساری خواہشات لکھ لیں تو مسکرا کر بولے۔ کیتھرین عرف کیٹ کے والد بہت امیر اور امریکا کے مشہور بزنس مین تھے۔ سو اس کی خواہشات بھی اسی طرح کی ہوتی تھیں۔ مہنگی مہنگی چیزوں کے نام اسے ازبر تھے جو شاید عام بچوں کو چاہی نہ ہوں۔ اس کی خواہشات اور خواب کافی مہنگے اور اونچے ہوتے تھے۔

"او کے مسٹر ابو! میں چلتی ہوں۔" ننھی کیٹ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے نزاکت سے کہا اور اپنی پھولوں کی نوکری اٹھا کر باہر کو نکل گئی۔ اس کے بعد مختلف رنگ، مختلف نسل کے چھوٹی بڑی عمر کے بچے ان کے پاس آتے رہتے اور اپنی پسند کے کاغذ پہ، اپنی خواہشات لکھواتے گئے۔ یہ بچے دنیا کے مختلف ملکوں سے آتے تھے اور ان کی وجہ سے مسٹر ابو کو بھی دنیا کے بہت سے ممالک کا پتا چل چکا تھا کیوں کہ یہ بچے اپنے ملک کی تہذیب، ثقافت اور روایات کے آئینہ دار ہوتے تھے اور ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور خواہشوں سے مسٹر ابو ان کے بارے میں بہت کچھ جان جاتے تھے۔

اس دن صبح سے آسمان پہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ مسٹر ابو کو خدشا تھا کہ کہیں بارش نہ ہو جائے۔ وہ بارش کی آواز سے جہت چرتے تھے، دیکھنا تو ذور کی بات تھی۔

آج صبح بے کوئی بچہ ان کے پاس نہیں آیا تھا۔ شاید خراب موسم کی وجہ سے مسٹر ابو، پھر بھی سفید اور سادہ کاغذوں پہ کچھ نہ کچھ لکھ

سب خواہشات اور خوابوں کو اکٹھا کر کے لے جاتے ہیں۔

مسٹر ابو کے گھر تک پہنچتے پہنچتے، بچے ہانپ کر رہ جاتے تھے کیوں کہ مسٹر ابو کا گھر بہت اونچائی پہ تھا۔ اپنے گھر آئے والوں کو مسٹر ابو بہت خوش دلی سے خوش آمدید کہتے تھے۔ ان کے گھر کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا، سوائے برسات کے دنوں میں۔ مسٹر ابو کو بارش سے بہت چڑھتی اور وہ اپنے گھر آنے والے سب بچوں کو تختی سے پانی یا ایسی کوئی بھی چیز لانے سے منع کرتے تھے کیوں کہ ان کو ڈر تھا کہ کہیں پانی سے ان کی کتابیں یا کاغذ خراب نہ ہو جائیں۔

"مسٹر ابو! کیسے ہیں آپ؟" گلابی رنگ کی خوب صورت سی فراک میں بلوں، ہاتھ میں پھولوں کی جھوٹی سی نوکری پکڑے، بلاشبہ وہ بچی بہت خوب صورت تھی، جس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مسٹر ابو اس نیلی آنکھوں والی بچی کو بہت اچھی طرح سے جانتے تھے جو اکثر و بیشتر ان کے پاس اپنی کوئی نہ کوئی خواہش یا خواب لے کر آتی تھی۔ بہت نخریلی سی لڑکی تھی۔ اسے کوئی کاغذ اتنی جلدی پسند نہیں آتا تھا۔ وہ کافی دیر تک مسٹر ابو کو ستاتی تھی، پھر جا کر مطمئن ہوتی تھی۔

"مس کیتھرین! آج آپ کافی دنوں کے بعد آئی ہیں۔ بتائیے کون سا کاغذ پسند کریں گی آپ اپنی خواہش کے لیے۔" مسٹر ابو نے مسکراتے ہوئے دس سال کی اس بچی کو دیکھا جو بہت نزاکت کے ساتھ اپنی فراک سنبھالے سامنے رکھی کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔ پھولوں کی نوکری اس نے میز پہ رکھ دی تھی۔ اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھوں سے مسٹر ابو کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اوہ مسٹر ابو! کتنی بار کہا ہے کہ مجھے کیتھرین نہیں، کیٹ کہا کریں۔" کیتھرین نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا تو اپنی عینک کے پیچھے سے جھانکتے مسٹر ابو مسکرا دیے اور میز پہ رکھا سوم بیوں کا شیشے کا مرتبان اس کو پیش کرتے ہوئے بولے۔

"او کے مس کیٹ..... کیا آپ اپنے لیے کاغذ خود پسند کریں گی یا میں کروں؟"

"مسٹر ابو! آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ مجھے گلابی رنگ پسند ہے، اور میں ہر بار گلابی رنگ کے کاغذ پہ ہی اپنی خواہش لکھواتی

رہے تھے کہ لکھنا ان کی عادت اور ہاتھوں کی مجبوری تھی۔

اس وقت ان کے دروازے پہ کھٹکا ہوا تو انہوں نے پیوٹک کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں دو بہت کمزور اور مفلوک الحال بچے ڈرے سہے اندر جھانک رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں موجود پانی کی بوتل دیکھ کر مسٹر ابو غصے سے بولے۔

”اس بوتل کو پھینک دو۔ بدتمیز بچو! کیا تمہیں پتا نہیں کہ یہاں اس طرح کی کوئی بھی چیز لانا منع ہے۔“

دونوں بچے جو پہلے ہی بہت خوف زدہ اور ڈرے ہوئے تھے، فوراً انہوں نے بوتل پھینک دی اور مسٹر ابو کی طرف دیکھنے لگے جواب بھی خشکی سے انہیں گھور رہے تھے۔

”اب آجی جاؤ اندر.....!“ مسٹر ابو نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو دونوں بچے ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ چلتے اندر آ گئے۔ ان کا حلیہ کافی خراب اور بُرا تھا اور وہ بہت کمزور اور زرد لگ رہے تھے۔ مسٹر ابو نے اتنے بُرے حال میں کبھی کوئی بچہ نہیں دیکھا تھا۔ مسٹر ابو نے ان دونوں کا بغور جائزہ لیا۔ ایک بچہ پانچ سال اور دوسرا تقریباً

سات سال کے قریب تھا۔ ان کی سانسیں بُری طرح پھولی ہوئی تھیں اور چہرے پہ شدید مشقت اٹھانے کے تاثرات تھے۔

”ہاں اب بتاؤ! کون سا کاغذ پسند کریں گے آپ دونوں۔“ مسٹر ابو نے سامنے لگے مختلف رنگوں کے کاغذوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”نہیں..... کوئی سا بھی!“ سات سال کے بچے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پہ خشکی جمی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری اور اپنے ساتھ کھڑے ڈرے سہے بچے

کا ہاتھ دبا کر تسلی دی۔ مسٹر ابو نے غور سے ان کے اتر حلیے کو دیکھا۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ان عجیب و غریب بچوں کے لیے کون سا کاغذ منتخب کریں۔ آخر انہوں نے خشک آکر ایک سفید رنگ کا ساوہ کاغذ نکال لیا۔ اسی وقت بادل زور سے گرنے لگے اور بارش کی آواز آنے لگی۔ مسٹر ابو نے ناگواری سے ناک چڑھائی۔

”پھر وہی بارش.....“ مسٹر ابو نے خود کلامی کی۔

”بارش! سچ میں بارش ہو رہی ہے!“ پانچ سال کے ڈرے سہے بچے کے کمزور اور زرد پڑے چہرے پہ یکساں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی اور اس نے اپنے ساتھ کھڑے دوسرے بچے کا ہاتھ پکڑ کر زور سے کھینچتے ہوئے خوشی سے پوچھا تھا تو اس نے بھی خوشی اور مسرت سے سر ہلا دیا۔ مسٹر ابو کی ناگواری مزید بڑھ گئی اور انہیں بلا وجہ ہی یہ بچے بُرے لگنے لگے تھے۔ ”آپ جلدی سے ہماری خواہش لکھ دیں۔“ اسی سات سال کے بچے نے مسٹر ابو کی طرف متوجہ ہو کر کہا تو مسٹر ابو تپ گئے۔ ”تم کچھ بولو گے تو میں نکھوں گا ناں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ آئے کہاں سے ہو؟“ مسٹر ابو نے ہاتھ میں پڑ پڑتے ہوئے سوال کیا۔



دوسرے بچے سے پوچھا جو خود بھی گھبرا گیا تھا اور تھک ہار کر زمین پر بیٹھ گیا۔
 "میں آپ سے کہہ بھی رہا تھا کہ جلدی کریں مگر آپ بھی
 دوسرے لوگوں کی طرح سوچ بچار میں دقت لگا دیتے ہیں۔" اس بچے
 نے کبری سانس لیتے ہوئے کہا تو مسٹر ابو چونک کر اس کی بگڑی حالت
 دیکھنے لگے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا تم دونوں کسی بیماری کا شکار ہو؟" مسٹر
 ابو نے پریشان لہجہ میں پوچھا تو اس بچے کے ہونٹوں پہ ہلکی سی
 مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

"میں اور میری طرح کے بہت سے بچے، قحط کے ریگستان میں
 غذائی قلت اور پیاس سے مر رہے ہیں! اس سال وہاں بارشیں نہیں
 ہوئیں اور اسی لیے پانی کا ذخیرہ نہ ہونے کی وجہ سے چند پرندہ سمیت ہر
 چیز ختم ہو رہی ہے۔ میرے ساتھ اور بھی بچے آئے ہیں مگر وہ کمزوری کی
 وجہ سے اوپر تک نہیں آ سکے اور نیچے وادی میں ہم دونوں کا انتظار کر رہے
 ہیں۔ ہم پانی کی خالی بوتل آپ کے پاس لائے تھے کہ آپ سے تھوڑا
 سا پانی لے کر ہم سب پی لیں مگر آپ نے بوتل اندر لانے ہی نہیں
 دی اور اب یہ پیاس سے بے ہوش ہو گیا ہے یا پھر.....!"

اس بچے نے غم ہوتی آنکھوں کے ساتھ بہت آہستہ آہستہ
 بولتے ہوئے کہا جیسے اس میں زیادہ بولنے کی سکت نہ ہو۔ مسٹر ابو نے
 گھبرا کر بے ہوش بچے کو ہلایا اور پھر بھاگ کر باہر آ گئے اور دروازے
 کے پاس پڑی بوتل کو اٹھایا۔ ان کے گھر میں پانی بالکل ختم تھا، اس
 لیے کہ وہ بہت کم پانی پیتے اور استعمال کرتے تھے۔ مسٹر ابو نے بارش
 کے پانی سے بوتل بھری اور واپس بھاگتے ہوئے ان دونوں بچوں
 کے پاس آئے جو نیم بے ہوش تھے۔ مسٹر ابو نے دونوں کے منہ سے
 پانی کی بوتل لگائی۔ دونوں نے بمشکل گھونٹ گھونٹ پانی پیا تھا۔ اس
 دوران بارش رک چکی تھی۔ مسٹر ابو کچھ سوچتے ہوئے، پانی کی بوتل
 لیے پہاڑ سے نیچے اترنے لگے جہاں ان دونوں بچوں کے ساتھی ان
 کے واپس آنے کے منتظر تھے۔

مسٹر ابو جب نیچے پہنچے تو تھک کر رک گئے۔ نیچے چھ سات بچے
 موجود ضرور تھے مگر وہ بھوک لار پیاس کی شدت سے کب کے مر چکے تھے!!
 مسٹر ابو نے حیرت اور خوف سے ان کی طرف دیکھا۔ پانی کی

"ہم..... یہاں سے بہت دور آہا ایک ملک پاکستان سے آئے
 ہیں، مگر آپ جلدی کریں ہم بہت مشکل سے یہاں تک پہنچے ہیں۔"
 اس بچے نے جچھے دروازے کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا
 جیسے وہاں کوئی اس کا منتظر ہو۔

"یہ کون سا ملک ہے؟" مسٹر ابو نے چونک کر ان سے پوچھا اور
 پھر اپنی میز پر رکے برائے سے غصہ میں ملک پاکستان دیکھنے لگے۔
 یہ غصہ ششے کا بنا تھا جس میں اس ملک کے نام پہ انگلی رکھیں تو ایک
 سکرین روشن ہو جاتی تھی اور اس میں اس ملک کی فلم یا سلائیڈ چلنے لگتی
 تھی جس میں اہم معلومات ہوتی تھیں۔ مسٹر ابو نے کچھ دیر غور سے
 ملک پاکستان کے متعلق چلتی ہوئی سلائیڈ دیکھیں اور پھر بولے۔

"اچھا! تو تم لوگ اس تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملک سے تعلق
 رکھتے ہو۔ خیر بتاؤ! یہاں کیوں اور کس لیے آئے ہو؟"

مسٹر ابو نے دو بار دو بچوں کی طرف متوجہ ہو کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 "انگل ہم بہت مشکل میں ہیں اور اسی وجہ سے ہم سب بچوں
 نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم پوری دنیا میں سب کے پاس جائیں گے اور
 سوئے ہوئے لوگوں کو جگا دیں گے، اپنی حالت زار بتائیں گے۔ آپ
 جلدی سے ہماری خواہش لکھ لیں، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"
 اسی سات سال کے بچے نے بے چینی سے اپنے ساتھ کھڑے
 بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ مسٹر ابو نے اس کی بات پہ چونک کر اسے دیکھا۔
 "ہاں بتاؤ! کیا خواہش ہے تمہاری؟"

"ہمیں ذخیرہ سارا پانی چاہیے! جیسی بارش آپ کے یہاں ہو رہی
 ہے، ایسی بارش چاہیے!" بچے نے جلدی سے اپنی خواہش بتائے
 ہوئے کہا تو مسٹر ابو چونک گئے۔ "یہ کیسی عجیب و غریب خواہش ہے۔"
 "آپ جلدی سے لکھ دیں۔ ہم نے اللہ سے بہت دعائیں بھی
 کی ہیں اور دعا کے ساتھ ساتھ عملی قدم بھی اٹھا رہے ہیں تاکہ ہم
 سوئے ہوئے لوگوں کو جگا سکیں جنہوں نے ہماری طرف سے آنکھیں
 بند کر لی ہوئی ہیں۔" بچے نے جلدی سے کہا تو مسٹر ابو حیران نظروں
 سے انہیں دیکھتے رہ گئے۔ اسی وقت ساتھ کھڑا ہوا پانچ سال کا بچہ
 نیچے گر گیا تو مسٹر ابو جلدی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھے۔

"کیا ہوا؟" مسٹر ابو نے اس بچے کو ہلاتے ہوئے سات سال کے

شب قدر

شب قدر جاگنے کا مزا اور ہی کچھ ہے
اس شب میں مانگنے کا مزا اور ہی کچھ ہے
مانگو جو مانگتے ہو ملے گا ضرور پرا
اس رب کریمی کی عطا اور ہی کچھ ہے
یوں تو ہے شب قدر برابر ہزار سال
یہ کچھ بھی نہیں اس سے سوا اور ہی کچھ ہے
آؤ کہ شب قدر میں سب کچھ سمیٹ لیں
اس شب میں تو دیتا ہے خدا اور ہی کچھ ہے
مومن پہ ہمہ وقت ہیں رحمت کی گناہیں
اس شب میں تو رحمت کی گھٹا اور ہی کچھ ہے
ہر ایک گناہ گار پہ بخشش کی نظر ہے
اس شب میں تو مولا کی ادا اور ہی کچھ ہے
روشن شب قدر ہے خورشید سے بڑھ کر
عاجز مگر اس شب کی ضیاء اور ہی کچھ ہے

الغزل ماز

"انسانیت" میں چھپا ہوا ہے اور انسانیت کا تعلق کسی بھی مخصوص
رنگ، نسل یا قوم سے نہیں ہوتا ہے۔

"انسانیت" کا تعلق صرف "انسان" سے ہوتا ہے اور مسز ابو نے
خود کو ایک اچھا اور بہتر "انسان" ثابت کرنا تھا اور "انسانیت" کا بہت
ساقرض اتارنا تھا تاکہ کل کو کوئی بچہ بھوک، پیاس کی شدت سے موت
کے منہ میں نہ چلا جائے۔ بچے تو سارے ایک جیسے ہوتے ہیں چاہے
تھر یا چولستان کے ریگستانوں کے ہوں یا بھوک پیاس سے جلتے
ایتھوپیا، صومالیہ جیسے اور بہت سے ممالک کے ہوں۔ خواب اور
خواہشات بسطے سب کی ایک جیسی نہ ہوں مگر بنیادی ضرورتیں سب کی
ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ اس دن کے بعد سے مسز ابو نے کبھی بھی
بارش کو برا نہیں کہا تھا کیوں کہ وہ جان گئے تھے کہ خدا کی دی گئی نعمتوں
کی ناشکری نہیں کرنی چاہیے اور مسز ابو ایک اچھے اور رحم دل انسان
تھے اور ایسے لوگ ناشکرے نہیں ہوتے ہیں!

ہوٹل ان کے ہاتھ سے گر گئی۔ وہ واپس بھاگتے ہوئے پھولی سانسوں
کے ساتھ اوپر پہنچے۔ وہ دونوں اپنے نیم را آنگھوں سے انہیں واپس آتا
دیکھ رہے تھے۔ مسز ابو نے کچھ سوچ کر اپنے گلوب پہ انگلی رکھی اور دنیا
کے غریب اور ترقی پذیر ممالک کا جائزہ لینے لگے۔ غربت، بھوک،
پیاس نے کتنے ہی معصوم اور غریب بچوں کی جان لی تھی۔ ایتھوپیا
میں بچوں کی حالت زار دیکھ کر مسز ابو کے روٹنے کمرے ہو گئے۔ ان
کا دل، دکھ کی شدت سے پھٹنے والا ہو گیا۔

"میں نے آج تک کتنی بے خبر اور مست زندگی گزاری ہے۔
جس بارش سے اتنا چڑھتا تھا، وہ بارش کتنے لوگوں کے لیے رحمت اور
زندگی کی امید ہے، مجھے پتا ہی نہ تھا۔۔۔۔۔!" مسز ابو ان دونوں بچوں
کے پاس پہنچے اور زمین پہ بیٹھ گئے۔ اپنے دونوں بازو داکر کے ان نیم
بے ہوش اور بے جان ہوتے بچوں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ پانی
سے چڑنے اور اپنے گھر میں پانی کے ایک قطرے کو بھی برداشت نہ
کرنے والا، مسز ابو خاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ان دونوں بچوں نے
حیرت سے انہیں روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس دن مسز ابو اتار دئے
کہ ان کے آنسوؤں سے ساری کتابیں، سارے کاغذ بھیک گئے
تھے۔ ان کا دل انسانیت کی تکلیف اور درد پہ تڑپ اٹھا تھا اور ان کے
آنسوؤں نے سیلاب کی صورت اختیار کر لی تھی جس میں یہ مثلث نما
بنا گھر ڈوب چکا تھا۔

اس دن کے بعد سے مسز ابو جتنے سال بھی جیئے، انسانیت کی
خدمت کرتے رہے۔ ان دو بھوکے پیاسے بچوں کو انہوں نے بچالیا
تھا مگر دنیا کے کونے کونے میں نجانے کتنے ہی معصوم بچے، غربت کی
چکی میں پستے، اسی بھوک و پیاس سے مر جاتے ہیں۔

بہت دیر سے ہی سہی مگر مسز ابو نے یہ راز جان لیا تھا کہ بیٹھ کر
لمبی لمبی باتیں کرنے سے لاکھ گنا بہتر ہے کہ ہم عملی طور پر "انسانیت"
کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کریں۔ اس دن کے بعد سے مسز ابو نے
کبھی کوئی دش یا خواب نہیں لکھا تھا۔ اس لیے کہ وہ جان گئے تھے کہ
خدا کے لائق اور فرشتے نہ کام بہت اچھے طریقے سے کر رہے ہیں اور
اس تک پہنچا رہے ہیں مگر ہمیں خود اس خدا تک پہنچنے کے لیے خواہش
کی نہیں بلکہ "عمل" کی ضرورت ہے۔ "انسان کا افضل ہونا اس کی

10۔ علامہ اقبال کے مرشد کون تھے؟
 الف۔ مولانا روم ای۔ حافظ شیرازی ایی۔ شیخ سعدی

جوابات علمی آزمائش جون 2014ء

1۔ روزہ دار 2۔ خانہ کعبہ 3۔ تنگ 4۔ نظیر اکبر آبادی 5۔ 9 نومبر 1914ء
 6۔ کوروا 7۔ سکر 8۔ ریڈ کلف لائن 9۔ 5 اگست 1947ء 11۔ ستمبر 1947ء
 10۔ مولوی عبدالحق

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے
 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔
 ☆ عائشہ نسیم، لاہور (150 روپے کی کتب)
 ☆ محمد خذیفہ فارانی، اسلام آباد (100 روپے کی کتب)
 ☆ حمیدہ نسیم، کراچی (90 روپے کی کتب)

دامع لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام یہ ذریعہ قرعہ اندازی:
 عبید شریف، میانوالی۔ حدیقہ عارف، لاہور۔ عنبرہ علی لوہانی، ڈیرہ
 اسماعیل خان۔ شہزاد، بہار۔ رضوان اشہد، پشاور۔ عروہ فاطمہ بٹ،
 ثواب شاد۔ وانیہ شیخ، کوئٹہ۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ اریبہ،
 صہیب، حباب، راولپنڈی۔ محمد قمر الزمان، خوشاب۔ محمد شہریار رمضان،
 ننگرانہ صاحب۔ محمد علی رفیق، راولپنڈی۔ محمد صفی خان، پشاور۔ شرن
 عظیم، اسلام آباد۔ آمنہ بنت حبیب الرحمن، کراچی۔ زینب انوار، رحیم
 یار خان۔ ولید احمد، گوجرانوالہ۔ محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ مریم شہباز
 راجپوت، گوجرانوالہ۔ اسد محمد خان، میانوالی۔ ہمایوں رشید، اسلام
 آباد۔ فتح محمد شادق، خوشاب۔ ملک محمد فرحان، واہ کینٹ۔ عائشہ
 صدیقہ، پشاور۔ ہمایوں اسلم چوہدری، قصور۔ منزل علی جعفری، شور
 کوٹ۔ اشراق امین، لاہور۔ سید محمد علی حسن، لاہور۔ محمد احمد ریاض،
 اوکاڑہ۔ خالیہ ارم، لاہور۔ محمد نعیم امین، لاہور۔ القدس اکرام، انک۔
 مصباح صادق، لاہور۔ علقشہ بتول، لاہور۔ اشفاق احمد، کراچی۔ ام
 فاطمہ، گجرات۔ شہر ناز، کوٹ ادو۔ خدیجہ نور، کوئٹہ۔ رومی اصغر،
 لاہور۔ عمران علی، سرگودھا۔ نسیم اختر، ساہی وال۔ محمد عبداللہ فاروق،
 راولپنڈی۔ مریم صفدر، گجرات۔ حائقہ منزل، پشاور۔ ملک مختار
 اعوان، سرگودھا۔ شہریار علی، پیرور۔ ذوالقرنین حسین، حیدر آباد۔
 زینب انظہر، سی۔ محمد جبار، خوشاب۔ نمرہ سعید، گوجرانوالہ۔ ارم نواز،
 جڑانوالہ۔ عائشہ نوید، سیالکوٹ۔ عبید اللہ انور، پشاور۔ کرن بٹ،
 جہلم۔ ثوبیہ آفاق، کراچی۔ وقار حبیب، خانیوال۔ عمران ارشد، ملتان۔



درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ گھڑی کے اسپرنگ کا تلاء کون سی توانائی کہلاتا ہے؟

ای۔ کشش توانائی ایی۔ پمپشل توانائی ایی۔ الیکٹریک توانائی

2۔ لفظ انسان کے کیا معنی ہیں؟

ای۔ سنا جانے والی ایی۔ مانی جانے والی ایی۔ نیکی کی بات

3۔ چھٹے نکلے کا کیا نام ہے؟

ای۔ راکٹر ایی۔ کلمہ توحید ایی۔ کلمہ شہادت

4۔ تانہ اور سن مانے سے کون سی چیز بنتی ہے؟

ای۔ لولہ ایی۔ کلسی ایی۔ پیتل

5۔ دریائے سندھ کا دوسرا نام کون سا ہے؟

ای۔ شالامار ایی۔ اباسین ایی۔ مہران

6۔ روشنی کی چمک کی اکائی کا کیا نام ہے؟

ای۔ ریڈ ایی۔ لیومن ایی۔ برقیہ

7۔ گولف کے میدان کو کیا کہا جاتا ہے؟

ای۔ رنگ ایی۔ لک ایی۔ پارک

8۔ پاکستان کے کس شہر کو شیردن کا شہر کہا جاتا ہے؟

ای۔ گجرات ایی۔ منڈی بہاؤ الدین ایی۔ ملتان

9۔ کس اسلامی ملک کا سمندر امرگوں سے ملتا ہے؟

ای۔ مصر ایی۔ سعودی عرب ایی۔ افغانستان



کھیلو، کودو، نماز پڑھو اور سو لو
کل کے لیے تم رہو تیار
سکول سے تاکہ پڑے نہ مار
چھٹی کا دن مت ضائع کرنا
اس دن بھی کچھ لکھنا پڑھنا
(جریہ یونس، لاہور)

غیبت

حضرت حسن بصریؒ سے کسی نے آکر کہا: "فلاں شخص نے
آپ کی غیبت کی ہے۔" حضرت حسن بصریؒ نے اسی وقت تازہ
چھوہارے منگوائے اور ایک طباق میں رکھ کر اس شخص کے پاس
بھیج دیے۔ اس شخص نے کہا: "میں آپ کا بڑا شکر گزار ہوں کہ
آپ نے میری غیبت کر کے اپنی نیکیوں کو میرے نامہ اعمال میں
غفل کر دیا ہے۔ آپ کے احسان کا بدلہ میں نہیں چکا سکتا تاہم یہ
حقیر سا تحفہ قبول فرمائیے۔" وہ شخص حضرت حسن بصریؒ کے اس حسن
سلوک سے اتنا متاثر ہوا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی
(عائشہ اور یونس، علی پور)

سفرے اقوال

☆ کسی کو غم دینے میں آپ کو خوشی تو مل سکتی لیکن کسی کو خوشی
دینے میں آپ کو غم نہیں مل سکتا۔ (حضرت علی)
☆ اگر زندگی کو ہمیشہ خوشیوں کے سہارے گزارنا چاہتے ہو تو غم
زدہ لوگوں کے غم سنا کر وہ کبھی دگھی نہیں ہو گے۔ (حضرت علی)
☆ ایسی امیدوں سے دور رہو کیوں کہ وہ تمہارے پاس موجود
نعمتوں کو حقیر بنا دیتی ہیں۔
☆ غصے کی حالت میں انصاف کرنا مشکل ہوتا ہے۔ (حضرت عمر)
☆ دنیا کی عزت مال سے ہے اور آخرت کی اعمال سے۔ (حضرت عمر)
(آئمہ سلام، اسلام آباد)

حمد باری تعالیٰ

وہ جو اپنی مخلوق پر کرم فرماتا ہے
وہ جو پتھروں میں بھی کیڑوں کو رزق پہنچاتا ہے
دیتا ہے ہدایت جو گناہ گاروں کو بھی
وہ جو سارے جگ کو کھلاتا ہے
چلتی ہیں ہوائیں بھی اسی کے حکم سے
وہ جو بادلوں سے بارش کو برساتا ہے
چمکاتا ہے دن کو، دے کر سورج کو روشنی
وہ جو چاند ستاروں سے آسمان کو سجاتا ہے
دکھاتا ہے قدرتی قدرت کے ایسے بھی نظارے
وہ جو کبھی فتنوں کو بادشاہ بناتا ہے
ماتمی ہے مریم اسی سے بھلائی کی دعائیں
وہ جو بن مائے بھی بڑے کام بناتا ہے
(کاوش، مریم صدیقہ، کمرات)

چھٹی کا دن

جب بھی چھٹی کا دن آیا
ہر بچے کا دل ابراہیم
بچہ لیکن یاد رکھنا
وقت کو تم برباد نہ کرنا
اپنے بچے کو تم چیک کر لو
خال ہیں تم نیکی سے بھر لو
کاپی، گلم، کتاب کو دیکھو
پنل، ریو، حساب کو دیکھو
اپنی دردی کو دھو لو

جنت

جماعت میں استاد طالب علموں سے گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگا:
"تم میں سے جو طالب علم مجھے مٹھی بھر جنت کی مٹی لا کر دے تو وہ
تم میں کامیاب طالب علم ہوگا۔"
اگلے دن ایک چھوٹا بچہ مٹھی بھر مٹی لے کر استاد کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ استاد نے مٹی دیکھی تو کہنے لگا: "بچہ تم مجھ سے
مذاق کر رہے ہو بھلا جنت کی مٹی ہم کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟"
بچے نے نم آنکھوں کے ساتھ معذرت سے کہا: "جناب یہ مٹی
میں اپنی ماں کے قدموں کے نیچے سے لایا ہوں۔ آپ مٹی نے تو
ہمیں سکھایا ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔"

(نور اہل شاہین انصاری، چوبنگ)

مساوات

زندگی بے بس خاموش پرندے کی طرح وقت کو اڑاتی، دے
پاؤں کئے جا رہی ہے۔ جیسے کوئی ہوا اپنے ساتھ فحش و خاشاک
سب اڑا لے جائے۔ غم چائس بن کر کبھی سانس روکتے ہیں مگر
خوشی کا نوالہ نکلے ہی سانس پھر بحال ہو جاتے ہیں۔
یہاں کچھ ایسے ہیں جو ایک مسکراہٹ اور خوشی کے ایک ہلکا
ترستے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو خوشیوں سے دامن بھرے چاندی
ٹھنڈک میں گزارتے ہیں اور کچھ تو کفن بھی ادھار کا پہنا کرتے
ہیں لیکن یہاں مساوات ہے کیوں کہ قبر امیر اور غریب کی ایک ہی
مٹی سے تیار ہو جاتی ہے۔

(ماہانہ محمد اسامہ، نیا طاہر، دہلی)

انجمنی باتیں

☆ ہر عمل کے اندر سے اس کا انجام یوں چھپا ہوتا ہے جیسے بیج
کے اندر درخت۔
☆ اپنے آپ سے زبردستی مت کریں ورنہ ٹوٹ جائیں گے۔
☆ اس کی فائدہ دہیں اترتی ہے جہاں پیار، صلح اور مہربانی
دعوت پہنچتی ہے۔
☆ اندھیرے سے مت گھبراؤ کیوں کہ جتنی بیٹھ اندھیرے میں
ہی چمکتے ہیں۔

(نور اہل شاہین، لاہور)

☆☆☆

اقوال داستان شاہ

☆ جو شخص خود کو اصلاح سے مبرا سمجھتا ہے، وہی سب سے زیادہ
قابل اصلاح ہے۔
☆ جس شخص میں تنقید سنے کی ہمت نہیں ہوتی، سب سے زیادہ
تنقید اسی پر کی جاتی ہے۔
☆ کتاب بہترین ساتھی ہے اور کتاب خوانی سب سے بہترین
مصرفیت ہے۔
☆ انجمنی تقدیر منت کے قلم سے لکھی جاتی ہے۔
☆ آزادی کا شجر شہیدوں کے خون سے پروان چڑھتا ہے۔

(غدیہ نشان، کاموکی)

دوستی

☆ خدا کے نزدیک بہترین دوست وہ ہے جو اپنے دوست کا خیر
خواہ ہو۔
☆ غریبوں کے ساتھ بیٹھ دوستی رکھ جب کہ امیروں کی مجلس
سے پرہیز کر۔
☆ دشمن ایک بھی بہت ہے۔ دوست زیادہ بھی تھوڑے ہیں۔
☆ غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔
☆ اگر کوئی قابل شخص دوستی کے لیے نہ ملے تو نابال سے دوستی مت کر۔

ستہری باتیں

☆ علم عمل کو آواز دیتا ہے، پس اگر وہ جواب دے تو ٹھہرتا ہے
ورنہ کوئی کر جاتا ہے۔
☆ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ بدلہ نہیں لیتا۔
☆ آدمی کے اسلام کی خوبی امور بے فائدہ کو چھوڑ دیتا ہے۔
☆ اگر تمہارا کھانا حسب خواہش نہ ہو تو اس کو نہ مانہ کہو۔
☆ تمہارا اپنے بھائی سے ملنے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔

(سیدہ زہرا حسین، لاہور)



کھیلوں کا بادشاہ اور بادشاہوں کا کھیل

فاضل ہو گئے۔ قطب الدین کو قرآن مجید سے اس قدر لگاؤ تھا کہ لوگ انہیں "قرآن خوان" کہنے لگے تھے۔ نیشاپور میں قطب الدین ایک نے تگوار بازی، نیزہ بازی، تیر اندازی اور شہسوار کی فنون سیکھے اور پورا (چوگان) کے کھیل سے دل چسپی تھی۔

قاضی کی وفات کے بعد قاضی کے ایک صاحب زادے نے قطب الدین کو ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس تاجر نے قطب الدین کو سلطان شہاب الدین محمد غوری کی خدمت میں پیش کیا، لیکن سلطان نے قطب الدین کو قیمت دے کر خرید لیا۔ غلام قطب الدین نے اپنے نئے مالک سلطان شہاب الدین محمد غوری کی خوب خدمت کی اور وہ سلطان کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ سلطان نے قطب الدین کو اپنے درباری امیروں میں داخل کر لیا اور ایک اعلیٰ عہدے پر بھی فائز کر دیا اور اس کے بیٹھنے کے لیے اپنے تخت کے سامنے ایک خاص جگہ مقرر کر دی تھی۔ جب سلطان اور خراسان کے بادشاہ کے درمیان لڑائی چھڑ گئی تو اس جنگ میں قطب الدین دشمن کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے، لیکن دشمن کی فوج کے گھیرے میں آ گئے اور گرفتار ہوئے۔ دشمن نے اسے لوہے کے ایک ٹھمرے میں بند کر کے قید کر دیا تھا۔ مگر چند دن بعد سلطان شہاب الدین محمد غوری کے لشکر نے دشمن کو شکست دی۔ جس لوہے کے ٹھمرے میں قطب الدین قید کیا گیا تھا اسے ایک اونٹ پر لاد کر سلطان کے سامنے لایا گیا تو سلطان نے خود قطب

پولو جسے کھیلوں کا بادشاہ اور بادشاہوں کا کھیل کہا جاتا ہے، متفقین کے مطابق پولو نے وسطی ایشیا میں جنم لیا، ایران میں پرورش پائی اور گلگت بلتستان اور چترال میں جوان ہوا۔ پولو کو "چوگان" بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور مسلمان بادشاہ قطب الدین ایک پولو کے کھیل کا بہت شوقین تھا۔ قطب الدین کی موت بھی پورا کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ہوئی تھی۔ قطب الدین ایک اصل میں کون تھا؟ پولو کے کھیل سے پہلے اس کھیل کے شوقین بادشاہ کے بارے میں آپ کو بتاتے ہیں جس کی وجہ سے اسے بادشاہوں کا کھیل کہا جاتا ہے۔

قطب الدین ایک کا اصل وطن ترکستان تھا جہاں وہ ایک نامی ایک ترک قبیلے میں پیدا ہوا، اسی لیے قطب الدین ایک کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب بہت سے ملکوں میں غلاموں کی خرید و فروخت کا کام ہوتا تھا۔ قطب الدین کو اس کے بچپن میں ایک سوداگر ترکستان سے خرید کر ایران کے شہر نیشاپور لے گیا اور پھر وہاں ایک قاضی فخر الدین عبدالعزیز کوئی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ یہ قاضی بہت بڑے عالم تھے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کی اولاد میں سے تھے اور نیشاپور کے قریبی علاقوں کے حاکم بھی تھے۔ انہوں نے قطب الدین کو بہت اچھی طرح رکھا۔ قرآن مجید اور دوسرے دینی علوم کی تعلیم بہت توجہ اور شفقت سے دی کہ وہ عالم

کو اپنا بیٹا مانا۔ ہندوستان میں ان کا ایک ہی دشمن نہ تھا، دریا
دلی اور سوات نے ان کوں کے دل کو وہ لیے تھے۔

1200ء میں سلطان کی وفات کے بعد خاندان غلاماں کی بنیاد
رکھی، اس کے بعد خاندان غلاماں کے نو اور حکمران آئے۔ قطب
الدین نے بادشاہ بننے ہی مسلمانوں کو اسلامی شریعت کے مطابق
زندگی گزارنے کی تلقین کی اور برائی رسوں سے پرہیز کرنے کی تاکید
کی۔ ساتھ ہی عدل و انصاف کی ایسی مثال قائم کی کہ آئندہ نسلوں
کے لیے نمونہ بن گئی۔ قطب الدین کے دور میں کسی طاقتور کی مجال نہ
تھی کہ کسی کم زور پر ظلم کر سکے۔ ان کے لشکر میں ترک، افغان، غوری
اور غلجی وغیرہ شامل تھے۔ سب مل کر رہتے کوئی کسی کے ساتھ ناانسانی
نہ کرتا، تمام رعایا خوش حال، مطمئن زندگی بسر کرتی تھی۔ مسلمان ہی
نہیں غیر مسلم بھی مسلمانوں کے ساتھ سخاوت سے حصہ پاتے تھے۔
قطب الدین دینی مدارس اور دین کے عالموں کی مالی سرپرستی کرتے،
مختلف علوم و فنون میں کمال رکھنے والے وظیفہ پاتے تھے۔ ان میں
قادی، ادیب، صوفی اور شاعر شامل تھے۔

قطب الدین عمارتوں کے فن کے موجد تھے، دہلی اور دوسری
جگہوں پر پتھر کی شان دار عمارتیں بنوائیں۔ دہلی اور اجمیر میں شان
دار مسجدیں بھی تعمیر کروائیں۔ قطب الدین کی بادشاہت کا زمانہ
حکومت صرف چار برس رہا 1210ء میں پولو (چوگان) کھیلتے
ہوئے اچانک گھوڑے سے گر کر سخت زخمی ہوئے اور پھر انتقال کر
گئے۔ لاہور میں پولو کھیلتے ہوئے وفات پانے والے بادشاہ قطب
الدین ایک کو لاہور کے انارکلی بازار میں دفن کیا گیا جہاں ان کا
مقبرہ تعمیر کر دیا گیا جو سیاحوں کے لیے توجہ کا مرکز ہے۔ اس نئی، علم
دوست اور عدل و انصاف کے بادشاہ کا نام تاریخ میں کئی حوالوں
کے ساتھ زندہ رہے گا۔ اس میں ایک حوالہ پولو کھیل کا بھی ہے جو
بڑے خطرہ کے دلچسپ کھیل ہے۔ جب بھی پولو کھیل کا ذکر ہوگا قطب
الدین ایک کا ذکر بھی ہوگا۔ شاید اسی لیے اس کھیل کو کھیلوں کا
بادشاہ اور بادشاہوں کا کھیل کہا جاتا ہے کہ مسلمان بادشاہ اس کھیل
کا شوقین تھا اور اس کھیل کو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر فوت ہوا
تھا۔ پولو کیسے کھیلا جاتا ہے اور پاکستان میں کن علاقوں میں یہ کھیل
مشہور ہے آئندہ شمارے میں بتائیں گے۔

الدین کو لوہے کے ہتھیرے سے لکلا اور اس کے گلے میں ہونہیر
تھی اس کی جگہ گلے میں ہیروں کا ہار پہنا دیا۔

یہ 1191ء کی بات ہے جب سلطان شہاب الدین محمد
غوری نے شمالی ہندوستان کا رخ کیا اور اجمیر، دہلی وغیرہ فتح کر
کے ان پر قطب الدین کو حاکم بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کو
اس فوج کا سپہ سالار بنا دیا جو اس نے ہندوستان میں چھوڑی اور
خود واپس غزنی چلا گیا۔ قطب الدین نے سلطان کے جانے کے
بعد میرٹھ اور رتھور سمیت کئی اور علاقے فتح کر لیے۔ سلطان
نے قطب الدین کو غزنی بلا کر بے شمار انعامات سے نوازا۔ قیمتی
تحائف کے ساتھ قطب الدین نے غزنی واپس آ کر کئی اور
علاقے فتح کر لیے۔ محمد غوری نے اسے ہندوستان کا گورنر مقرر کر
دیا تھا۔ جب سلطان غوری نے قنوج اور بنارس کے راجہ سے
جنگ کرنے کے لیے ہندوستان کا رخ کیا تو قطب الدین نے
ان کی خدمت میں پچاس ہزار سوار، سو عربی گھوڑے اور سینکڑوں
ہاتھی اور اونٹ پیش کر دیے اور سلطان کے ساتھ مل کر قنوج اور
بنارس فتح کیے۔ اس لڑائی میں قطب الدین نے خوب بہادری
دکھائی کہ سلطان نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ قطب الدین اور اس
کے فوجی سرداروں کی فوجوں نے گجرات، راجپوتانہ، دریائے گنگا
اور جمنہ کا دواؤ بہار اور بنگال فتح کر لیے۔

1206ء میں سلطان شہاب الدین غوری ہندوستان کی آخری
مہم کے بعد پنجاب کے راستے اپنے وطن واپس جا رہا تھا۔ جہلم
کے قریب دمیک کے مقام پر بعض دشمنوں نے انہیں رات کو اس
وقت شہید کر دیا جب وہ اپنے خیمے کے اندر سو رہے تھے۔ سلطان
کی شہادت کے بعد سلطان کا بھتیجا محمود جانشین بنا۔ اس نے بھی
قطب الدین کو بہت عزیز رکھا اور خوب عزت دی اور سلطان کا
خطاب دے کر شمالی ہندوستان کے فتح کیے ہوئے سارے علاقوں
لاہور اور دہلی سمیت کا خود مختار بادشاہ بنا دیا۔ قطب الدین بادشاہ
بن کر بھی رعایا کا اخلاص و زما۔ لوگ اس سے محبت کرتے اور دعاؤں
دیتے تھے۔ قطب الدین کی حکومت کی وجہ سے رعایا نے ان کو
"لکھ بکس" کا خطاب دیا تھا جس کا مطلب حاجت مندوں پر
لاکھوں روپے کی بارش کرنے والا لوگوں نے قطب الدین کو حاکم
مانی بھی کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی سخاوت پورے شمالی ہندوستان

روزہ کے مسائل

ملفوظ محمد سعید اعظمی

اور غرض کہ روزہ نہ رکھنا جائز ہو جاتا ہے۔

۱۔ سفر یعنی مسافر کو حالت سفر میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے لیکن اگر سفر میں مشقت نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے۔ ہذا مرض یعنی ایسی بیماری جس میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو یا بیماری کے باعث جانے کا اندیشہ ہو۔ ہذا بہت بڑا معاملہ ہے۔ ہذا روزہ پلانا جبکہ روزہ پلانے والی کو اپنے کوروزے سے نقصان پہنچتا ہو۔ (اگر روزہ پلانے والی کو روزہ پلانے کے باوجود روزہ نقصان نہ دے تو پھر روزہ رکھنا ضروری ہے) ہذا روزہ سے اس قدر بھوک یا پیاس کا غلبہ ہو کہ جان نکل جانے کا اندیشہ ہو جائے۔ روزہ سے بے سکتا ہے یہ ہیں۔

۲۔ سحری کھانا۔ کھانا سے نیت کرنا۔ سحری آخری وقت میں کرنا بشرطیکہ صبح صادق سے پہلے فارغ ہو جائے۔ ہذا افطار میں جلدی کرنا۔ (یعنی جب افطاری کا وقت ہو جائے تو افطار کرنے میں تاخیر نہ کرنا) ہذا غیبت، جھوٹ، گالی گلوچ وغیرہ اور نرمی باتوں سے بچنا۔ ہذا چھو ہارے یا بھوسے سے روزہ افطار کرنا اور اگر یہ نہ ہو تو پانی سے افطار کرنا۔

روزہ میں جو باتیں کرنا ہیں۔

۱۔ گوشت چھاننا کوئی اور چیز منہ میں ڈالنے رکھنا۔ ہذا کوئی چیز چمکنا۔ ہاں جس صورت کا خاندان سخت اور ہمزاج ہو اسے زبان کی نوک سے سائین کا ٹک چکھ لینا جائز ہے۔ ہذا کھانے یا پانی ڈالنے میں سہاؤ کرنا۔ ہذا منہ میں بہت سا ٹھوک جمع کر کے نگھٹا۔ (۵) غیبت کرنا، جھوٹ بولنا، گالی گلوچ کرنا۔ ہذا بے قراری اور کھربستہ ظاہر کرنا۔ ہذا نہانے کی حاجت ہو جائے تو غسل کو قصد صبح صادق کے بعد تک مؤخر کرنا۔ ہذا کھلے چاکر یا ٹخنوں سے دانت مانگنا۔

جن چیزوں سے روزہ مکروہ نہیں ہوگا، ہذا سر نہ لگانا۔ ہذا بدن پر تیل یا سر میں تیل ڈالنا۔ ہذا ٹھنڈک کے لیے غسل کرنا۔ ہذا مسواک کرنا اگرچہ تازی ہو، جزا یا تر شاخ کی ہو۔ ہذا خوشبو لگانا یا سوکھنا۔ ہذا بھوسے سے کچھ کھالی لینا۔ ہذا خود غور بلا قصد سے ہو جانا۔ ہذا اپنا ٹھوک نگھٹنا۔ ہذا بلا قصد بھی یا بھوسے کا جلق سے آزار جانا۔

جن مسلمات سے صرف قضا واجب ہوتی ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ کسی نے زبردستی روزہ رواد کے منہ میں کوئی چیز ڈال دی اور وہ حلق سے اتر گئی۔ ہذا روزہ باوجود رکھ کر تے وقت بلا قصد حلق میں پانی اتر گیا۔ ہذا آنے اور قصد حلق میں نہ ہونے والی۔ ہذا قصد نہ بھر کر تے کر ڈالی۔ ہذا ٹکڑی یا پتھر کا ٹکڑا یا سنگی یا منی یا کھنڈ کا ٹکڑا قصد انگلی لیا۔ ہذا دانوں میں رہی ہوئی چیز کو زبان سے نگھ کر جب کہ وہ بچنے کے واسطے کے برابر یا زیادہ ہو۔ اگر منہ سے باہر نکال کر پھر نگھ لیا تو چاہے بچنے سے کم ہو یا زیادہ، روزہ ٹوٹ گیا۔ ہذا کان میں تیل ڈالا۔ ہذا حناؤں میں سے نکلے ہوئے خون کو انگلی لیا جب کہ خون ٹھوک پر غالب ہو۔ ہذا بھوسے سے کچھ کھالی لیا اور یہ سمجھ کر کہ روزہ ٹوٹ گیا ہے، پھر جان بوجھ کر کھالیا۔ ہذا یہ سمجھ کر کہ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی سحری کھالی، پھر معلوم ہوا کہ صبح ہو چکی تھی۔ ہذا رمضان شریف کے موارڈوں میں کوئی روزہ قصداً توڑ ڈالا۔ ہذا ابر یا غبار کی وجہ سے یہ سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہو گیا ہے، روزہ افطار کر لیا حالانکہ ابھی دن باقی تھا۔ ان سب صورتوں میں صرف ان روزوں کی قضاء کہنی پڑے گی جن میں ان باتوں میں کوئی بات پیش آئی۔

۲۔ رمضان شریف کے مہینے میں اگر کسی کا روزہ ٹوٹ جائے تو پھر بھی کھانا چھاننا جائز نہیں بلکہ اس کو لازم ہے کہ شام تک کھانے پینے وغیرہ سے رکاوٹ ہے ان لوگوں کو بھی باقی دن میں شام تک روزہ وادوں کی طرح رہنا واجب ہے۔

پزل کے ساتھ کوئی پہچان کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 جولائی 2014ء ہے۔

پزل کے ساتھ کوئی پہچان کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 جولائی 2014ء ہے۔

نام: _____
 مقام: _____
 مکمل پتا: _____
 موبائل نمبر: _____

نام: _____
 شہر: _____
 مکمل پتا: _____
 موبائل نمبر: _____

میری زندگی کے مقاصد

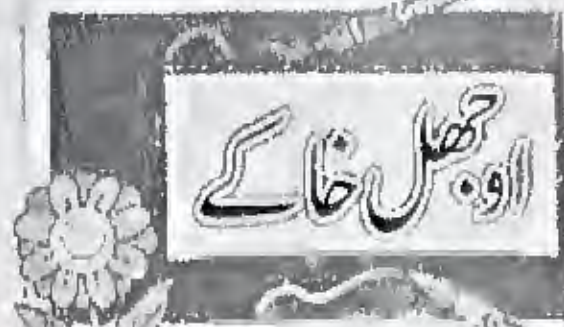
کوئی نہ کرے گا، اس وقت سارا چین تصور بھیجا ضروری ہے۔

نام: _____
 مقام: _____
 مکمل پتا: _____
 موبائل نمبر: _____

ہو نہ ہاں مصور

بروز کا موضوع "دن" اڑماں کرے کی آخری تاریخ 08 جولائی 2014ء ہے۔

نام: _____
 عمر: _____
 مکمل پتا: _____
 موبائل نمبر: _____



A black and white line drawing of three cats in winter clothing. Two cats stand together, one holding a large open book, while a third cat sits in front of them, also holding a book. They are in a snowy garden with a lantern and snowflakes.



محمد خالد یاسین
میں کرکٹر بن کر پاکستان کا نام روشن کرنا ہوں گا۔



فاطمہ ارمین شاہ
میں پاکستانی سیرنگار اور اسٹار بنوں گی۔



محمد احمد شاہی
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔



محمد شیب ارمین
میں بڑا اور کرناٹھ قرآن پڑھاؤں گا۔
میں کرکٹ و قوم کی خدمت کروں گا۔



ارشدی احمد کریمی
میں بڑا اور کرناٹھ پڑھاؤں گا۔



محمد عبداللہ اعظمی
میں عالم دین بن کر حق کی پاس داری کروں گا۔



ایم آر ایم ایم
میں انجینئر بن کر دینی انسانیت کی خدمت کروں گا۔
میں کرکٹ و قوم کی خدمت کروں گا۔



محمد ارمین شاہ
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔



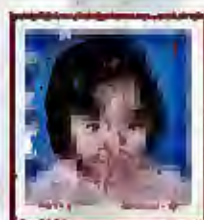
محمد شیب ارمین
میں بڑا اور کرناٹھ پڑھاؤں گا۔



محمد شیب ارمین
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔



محمد خالد یاسین
میں آئی جی بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔



محمد شیب ارمین
میں سرنج ڈاکٹر بنوں گی اور خیریت کا مانتا کروں گی۔



محمد شیب ارمین
میں ڈاکٹر بنوں گی اور ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔



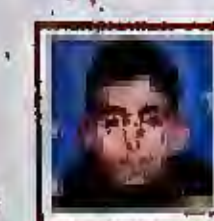
محمد خالد یاسین
میں ایک اچھا انسان بن کر معاشرے میں بہت سہولتیں لائوں گا۔



محمد شیب ارمین
میں انجینئر بن کر ملک اور ان پاپ کا نام روشن کروں گا۔



محمد شیب ارمین
میں کرناٹھ قرآن پڑھاؤں گا اور دینی خدمت کروں گا۔



محمد خالد یاسین
میں بڑا اور کرناٹھ پڑھاؤں گا۔



محمد شیب ارمین
میں اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی کوشش کروں گا۔



محمد شیب ارمین
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔



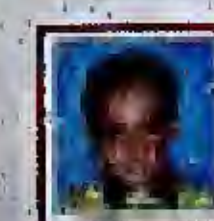
محمد خالد یاسین
میں آئی جی بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔



محمد شیب ارمین
میں بڑا اور کرناٹھ پڑھاؤں گا۔



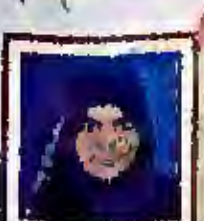
محمد شیب ارمین
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔



محمد خالد یاسین
میں بڑا اور کرناٹھ پڑھاؤں گا اور سہولتیں کروں گا۔



محمد شیب ارمین
میں پولیس آفیسر بن کر معاشرے میں برائیوں کا خاتمہ کروں گی۔



محمد شیب ارمین
میں ڈاکٹر بنوں گی اور کرناٹھ پڑھاؤں گی۔



ب	ذ	ژ	ج	ن	ا	ن	ب	ل	د
ض	م	ظ	س	و	ڈ	ا	ن	غ	ش
و	ص	ہ	ح	پ	ش	ء	ط	ت	ث
ن	ر	ف	ق	ط	ر	ص	ٹ	ی	ا
د	غ	ت	م	ن	م	خ	ی	و	ظ
ر	چ	ن	ی	ر	ح	ب	ر	ک	ے
ا	ی	ز	ع	ل	ڈ	ف	ا	ر	غ
س	ز	ت	ر	ک	ی	ر	ق	ح	م
ل	ف	م	س	ک	ط	ث	ص	ک	ا
ہ	ن	ا	ر	ی	ا	م	گ	ع	ش

آپ نے جو کچھ ملا کر اسلامی ملکوں کے نام تلاش کرتے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

قطر، شام، لبنان، بحرین، مصر، کویت، ترکی، اردن، ایران، سوڈان

پر کھڑے ہو سکتے ہیں، مہربانی کر کے میرے پیروں پر سے اتر جائیے۔
(امید، بن جادیہ، لاہور)

ماجد (عاطف سے): یاد آج میرے گلے میں بہت درد ہے۔

عاطف: یاد آج میرے سر میں بڑا درد ہے۔

ماجد: تو ٹھیک ہے تم میرا گلا دبا دو، میں تیرا سر دبا دیتا ہوں۔

(مباحثہ، گوجرانوالہ کینٹ)

ایک آدمی خون کے بارے میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ بیوی نے پوچھا: خون کے بارے میں معلومات کیوں پڑھ رہے ہو؟ شوہر بولا: ڈاکٹر نے کہا ہے کل خون کا ٹیسٹ ہے، اس لیے تیاری کر کے آنا۔

ایک دوا فروش مجمع میں اپنی دوا کی تعریف کر رہا تھا۔

حضرات! میں یہ دوا بیس سال سے فروخت کر رہا ہوں، آج تک یقین کریں کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔ مجمع سے آواز آئی کہ

(روشن ذہب)

مرنے کے بعد کوئی شکایت نہیں کرتا۔ ایک دوست (دوسرے دوست سے): میں کار میں جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں نے مجھے روک لیا۔ انہوں نے میری نقدی، گھڑی حتیٰ کہ کار بھی چھین لی۔

دوسرا دوست: لیکن تمہارے پاس ریوالور بھی تو تھا۔

پہلا دوست: شکر ہے ان کی نظر میرے ریوالور پر نہیں پڑی۔

(شہر بانو، لعل آباد)

ایک لڑکا ملازمت کے لیے اپنی کار میں دوسرے شہر جانے لگا تو ماں باپ نے خیریت سے نکل جانے کا حکم دیا۔ لڑکے نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے کہا: بس مجھے آپ کی دعا چاہیے۔

باپ نے جواب دیا: ہم دعا کرتے ہیں، لیکن بیٹا، یہ یاد رکھنا کہ ہماری دعائیں صرف 50 روپے کی رقم کی رفتار سے ساتھ دے سکیں گی۔

استاد (اسلم سے): تم کمر کا کمال کیوں نہیں کر کے لاتے؟

اسلم: جناب میں ہوش میں رہتا ہوں۔

بیٹا: اماں، اماں! گاؤں میں ایک دانتوں کا ڈاکٹر آیا ہے۔

اماں: اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے۔ کیا ہم لوگوں کے

دانت نہیں ہیں۔



باجی (نضحی سے): تم آنکھیں بند کر کے مٹائی کیوں کھا رہی ہو؟

نضحی: اس لیے کہ امی نے مٹائی کی طرف دیکھنے سے منع کیا ہے۔

(علیہ احمد، راول پنڈی)

استاد: تم دیر سے سکول کیوں آئے؟

شاگرد: سراسر راستے میں بورڈ لگایا گیا ہے۔ اس پر لکھا ہے کہ آگے

سکول ہے، آہستہ چلیں۔

مالک: کیا تمہیں جانوروں سے محبت ہے؟

نوکری: بالکل جناب! خاص طور پر بھنے ہوئے مرغ سے بہت محبت

کرتا ہوں۔

استاد: پرانے بادشاہوں کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟

شاگرد: وہ سب مر چکے ہیں۔

ایک دکان دار پیراشوٹ بچا رہا تھا۔ گاؤں کے پوچھا:

اگر میں دبانے کے بعد پیراشوٹ نہ کھلا تو؟

دکان دار: کوئی بات نہیں، تم دوسرا لے جانا۔

راہ گیر (بچے سے): تم نے اپنی انگلی میں دھاگہ کیوں باندھا ہوا ہے۔

بچہ: یہ دھاگہ امی نے باندھا ہے تاکہ میں خط ڈالنا نہ بھول جاؤں۔

راہ گیر: تو کیا تم نے خط ڈال دیا؟

بچہ: نہیں، امی مجھے خط دینا ہی بھول گئی۔

بس میں کمر ایک مسافر دوسرے سے کہنے لگا: جناب آپ کی عمر؟

دوسرے نے جھلک کر جواب دیا: 35 سال

پہلے مسافر نے بے ساختہ کہا: اس عمر میں تو یقیناً آپ اپنے پیروں

غم زدہ مینا فریاد

(میں کا گھر ان کے اندر ہی ہے)



میں ہوں اک مظلوم مینا ماما کا ایک نشان
کیا بتاؤں کس قدر غم گئیں ہے میری داستاں
کیا تمنائیں تھیں میری گھٹ کے جو اب رہ گئیں
لگ رہا ہے کہ زمیں سے مل گیا ہے آسمان
کس قدر مشکل سے دن بھر تکا تکا جوڑ کر
ناکمل سا بنا پائی تھی میں اک گھر یہاں
راکھ کر ڈالا کسی نے دیکھتے ہی دیکھتے
میری امیدوں کا مسکن میرا پیارا آشیاں
لٹ گیا میری امنگوں کا چمن سب لٹ گیا
اب مری آغوش میں ہیں آہیں، آنسو، سسکیاں
سخت تڑپاتی ہے اپنے ان جگر گوشوں کی یاد
خو ابھی تک تھے مکان دلا مکان کے درمیاں
بے سرو سامان مجھ معصوم کو کس نے کیا؟
کیسا ظالم تھا مجھے جو کر گیا بے حالماں
دیکھنے والوں کو کیا معلوم میرا حال دل
غم کی پرچھائیں ہیں یا پھر میں ہوں ان کے درمیاں
ہوں مبارک آپ کو عشرت کدے اپنے ضیاء
مجھ کو کافی میرے رب کے آسمان کا سائباں

آنسو شربت ضیاء

(890 فٹ) بلند ہے۔ ہر سال لاکھوں مسلمان اس عظیم مقام کو دیکھنے آتے ہیں جہاں رسالت مآبؐ پر وحی آتی تھی۔ حضرت جبریلؑ آپؐ کے پاس اللہ رب العزت کے پیغامات لاتے۔ لوگ یہاں آ کر روحانی سکون حاصل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ غار پہاڑ کے سرے پر نہیں بلکہ اس کے پہلو میں ہے۔ چنانچہ اس طرح سے موجود ہیں کہ خیمہ معلوم پڑتا ہے۔ غار کا رخ کچھ اس طرح ہے کہ یہ اندر سے ٹھنڈی ہے اور سورج کی روشنی براہ راست اندر نہیں پہنچتی۔ نئی پاک کئی کئی دن یہاں قیام فرماتے اور عبادت کرتے۔ حج کے موقع پر لاکھوں افراد یہاں آتے ہیں اور نوافل ادا کرتے ہیں۔ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے والوں کی بڑی تعداد بھی یہاں نوافل ادا کرنے آتی ہے۔



● پاکستان سمیت دنیا کے کئی علاقوں میں سمو سے (SAMOSAY) بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ یہ کچی یا

غار حرا (Cave of Hira) کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس غار میں محبوب الہی حضرت محمد ﷺ عبادت کے لیے تشریف لاتے تھے۔



تیل میں خوب تکی ہوئی جوسلزی نما خوراک ہے جس میں آلو، قیمہ یا چکن مہرا ہوتا ہے۔ خیال ہے کہ سمو سے بنانے کی ابتداء مشرق وسطیٰ (مصر وغیرہ) سے ہوئی۔ بعد ازاں مغلیہ عہد میں برصغیر پاک و ہند میں ان کی ابتداء ہوئی۔ آج یہ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش کے لوگوں کی پسندیدہ خوراک ہے جسے بطور تواضع استعمال کیا جاتا ہے۔ رمضان المبارک میں لاکھوں شہر سمو سے افطاری میں استعمال ہوتے

دنیا کے ہنگاموں سے کچھ دیر کے لیے الگ تھلگ گوشہ تنہائی میں آپؐ اپنے رب کو یہاں آکر یاد کرتے۔ یہ غار مکہ سے 3.2 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ غار جبل النور نامی پہاڑ میں واقع ہے جو سعودی عرب کے علاقے حجاز میں ہے۔ یہ غار 3.7 میٹر (12 فٹ) لمبی اور 1.60 میٹر (5 فٹ 3 انچ) چوڑائی میں ہے۔ غار 270 میٹر

کا سپرٹ (Spirit of Salt) کہا کرتے تھے۔ 13 ویں صدی میں پہلی بار اس تیزاب سے آگاہی ہوئی۔ ہائیڈروجن کلورائیڈ کو پانی میں حل کرنے سے یہ تیزاب حاصل ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ تیزاب اڑ جاتا ہے اس لیے یہ گیسوی تیزاب کہلاتا ہے۔ دنیا بھر میں ہر سال یہ تیزاب 20 ملین میٹرک ٹن سے زیادہ پیدا ہوتا ہے جس کی بڑی مقدار فیکٹریوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اسٹیل کی تیاری میں بھی یہ تیزاب استعمال ہوتا ہے۔ پلاسٹک،



بیسریوں کی تیاری، فوڈز، ادویات اور پانی صاف کرنے میں اس تیزاب کی بڑی اہمیت ہے۔ علاوہ ازیں چمڑے کی صفائی، پانی کی نیکی صاف کرنے اور "Food Additives" (ایسے مادے جو غذائیت کو برقرار رکھنے اور ذائقے کو محفوظ کرنے کے کام آتے ہیں) کی تیاری میں نمک کا تیزاب استعمال ہوتا ہے۔ انسانی معدہ (Stomach) کی دیواریں کیسٹرک جوں خارج کرتی ہیں جس میں ہائیڈروکلورک ایسڈ پایا جاتا ہے۔ اس کی پی اچ 1.3 ہوتی ہے۔ یہ خامرے (Enzyme) پیپسن (Pepsin) کو متحرک کرتا اور غذا میں جراثیم کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اس تیزاب کے بخارات آنکھوں، جلد، پیچھےروں اور آنکھوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ خطرناک تیزاب ہے، طلباء کو تجربہ گاہ میں احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے۔

ہیں۔ لفظ سموسہ فارسی زبان کے لفظ سمبوساگ (Sambosag) سے نکلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں میں اسی سے ملتے جلتے نام ملتے ہیں۔ ایرانی مفکر ابو الفضل بیہقی (1077ء - 995ء) اور برصغیر کے نامور اسکالر و شاعر امیر خسروؒ نے اپنی اپنی کتابوں میں سموسوں کا ذکر کیا ہے۔ امیر خسروؒ (1325ء - 1253ء) میں لکھتے ہیں کہ مغل شہزادے اور شہزادیاں سموسے کھاتے تھے۔ ابن بطوطہ معروف سیاح نے بھی چودھویں صدی میں اپنی تحاریر میں



سموسوں کا ذکر کیا ہے۔ کراچی کے کاغذی سموسے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ سموسے میں چکنائی بہت ہوتی ہے۔ اسی لیے انہیں کھانے سے جسم کا وزن بڑھتا ہے۔ دل کے مریضوں کو خاص طور پر احتیاط کرنی چاہیے۔ برما، نیپال، سری لنکا، ازبکستان، تاجکستان، آذربائیجان، انڈونیشیا، اری ٹیریا، ایتھوپیا، صومالیہ، اسرائیل، المدیپ، پرتگال، کینیا، عرب ممالک، برطانیہ و امریکہ میں بھی سموسے کھائے جاتے ہیں۔



نمک کا تیزاب یا ہائیڈروکلورک ایسڈ (Hydro Chloric Acid) ایک شفاف، بے رنگ اور ناک میں چبھنے والا تیزاب ہے جو صنعت میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ ماضی میں اسے نمک



پوچھو تو جانیں

4. رات سے کچھ سوئی آئیں
دوب کے آتے ہی مٹ جائیں
5. کالی اس کی وردی دھبی اس کی چال
ہر گھر میں دو ایسے پھرے جیسے کوتوال

(ثروت یعقوب، لاہور)

6. ریلوے ریل کو کہاں
ایک گھرے میں دو رنگ پانی
7. نہ کچھ کھائے نہ کچھ پیئے
دو ہاتھوں سے چلتا جائے
8. کالا گھوڑا اور سفید سواری
ایک کے بعد ایک کی باری

(غازیہ خان، لاہور)

1. اس کے کان پہ میرا منہ
میرے کان پہ اس کا منہ
پاس نہیں ہم دونوں پھر بھی
ہاتھ کیسے کیسے؟ بتاؤ!

(جہریہ یونس، لاہور)

2. ایک دادا کے سو پوتے
چلتے پھرتے سب میں ساتھ
سب کے پیٹ میں ایک ہی آنت
3. ایک قلعہ میں برج ہزار
برج برج میں پھرے وار
کیا جب قلعہ بنایا

لنہ 4-5، 6-7، 8-9، 10-11، 12-13، 14-15
16-17، 18-19، 20-21، 22-23، 24-25

نقطے ملاؤ اور رنگ بھرو



راستہ بتاؤ



2014 Dec



شیر خرمہ

سامان اور وزن:

دودھ: ایک لیٹر

سویاں: ایک پیالی

چینی: دو پیالی

لوہک: دو عدد

بادام: دس سے بارہ عدد (چلے اور ہار یک کئے ہوئے) پتے: پندرہ عدد (چلے اور ہار یک کئے ہوئے)

بھوئی الائچی: چھ عدد (ہار یک کھل لیں) گھی: دو کھانے کے چمچ (بھواری: آٹھ عدد) (سٹیلی نکال کر چار کڑے کر لیں)

ترکیب:

ایک دہکی میں گھی ڈال کر الائچیاں اور لوہک ڈال دیں۔ جب خوش بو آئے لگے تو سویاں ڈال کر تھکی بھولیں۔ سویاں نکال کر میوہ ڈال دیں اور اس کو نکال لیں۔ دہکی نیچے اتار کر پانچ منٹ کے لیے ٹھنڈی کر لیں۔ دودھ ڈال دیں۔ دودھ ڈال کر چینی ڈال دیں اور تھوڑی دیر کے لیے پکا لیں۔ جب چینی مکمل ہو جائے تو سویاں اور تمام تر میوہ ڈال دیں، جب دودھ گاڑھا ہو جائے تو گرم گرم کپنے کے لیے پیش کریں۔ (لوہک: میوہ کانٹے سے پہلے تینوں چیزوں کو پانچ منٹ کے لیے اہل لیں۔)

سویوں کا زردہ

سامان اور وزن:

سویاں: آدھا کلو

چینی: تین پیالی

بادام: دس عدد (ہار یک چلے ہوئے)

پانی: ایک پیالی

پتے: دس عدد (ہار یک کئے ہوئے)

بھوئی الائچی: (ایک چائے چمچ) چینی کے ساتھ ہوں لیں

گھی: چار کھانے کے چمچ

ترکیب:

ایک دہکی میں گھی ڈال کر گرم کریں۔ جب گرم ہو جائے تو الائچی ڈال دیں۔ خوش بو آنے لگے تو سویاں ڈال کر اچھی طرح بھولیں۔ پھر تھال میں نکال لیں۔ دہکی میں چینی اور پانی ڈال کر پکا لیں۔ شیرا بننے سے پہلے بھی ہوتی سویاں اور میوہ ڈال کر اچھی طرح بھولیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو اس میں نکال کر چاندی کے ورق سہا دیں۔



احالا کہاں ہے؟

اس آدمی کے سامنے پندرہ کے قریب بچے بیٹھے تھے، وہ سب کے سب خاموش تھے۔ وہ شخص اُن سے کچھ کہنا چاہتا تھا، اسی لیے سب بچوں کی نظریں اس کے لب بولنے کی منتظر تھیں۔ اُس شخص کے کپڑے اور وضع قطع بہت بہتر تھی لیکن اس کے چہرے پر رنج و الم کی کیفیت موجود تھی جو اس کی شخصیت کو عجیب بنا رہی تھی۔ بچوں کے ادب و آداب سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس شخص کو خاصی اہمیت دیتے ہیں۔

"ہاں تو، آپ ہم سے کوئی خاص بات....؟" اچانک ایک لڑکا ہمت کے بول پڑا۔ وہ شخص بھی جیسے اچانک نیند سے جاگ پڑا ہو۔ چند لڑکوں کی نگاہیں سوال کرنے والے لڑکے کی جانب اٹھ گئیں۔ انھیں ڈرتا کہ وہ شخص کہیں ناراض ہو کر اسے کچھ کہہ نہ ڈالے۔

"ہاں! میں کیا بات کر رہا تھا....؟" وہ آدمی جیسے بات کرتے کرتے کچھ بھول گیا تھا اس لیے اُس نے بچوں سے ہی سوال کیا۔

"جی.... وہ.... آپ اپنی زندگی.... کی کہانی...." ایک لڑکے نے کچھ بکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یاد آیا۔" اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں ادھر ادھر سمھاتے ہوئے کہا۔ اس کے مناسب رویے سے لڑکوں کی جان میں جان آگئی۔ ورنہ تو ایسے ہوتا تھا کہ کسی نے اپنی اوقات سے بڑھ کر

سوال کیا اور اسے جواب تمپھر کی صورت میں ملا۔

"معافی چاہتا ہوں اُستاد۔" اچانک ایک اور لڑکا اس محفل میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر فقیروں والا لباس تھا، ہاتھ میں چند نوٹ تھے جو اس نے اس شخص کی جانب بڑھانا چاہے لیکن اُس نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے موجود دیوی پر رکھنے کو کہا۔ اس لڑکے نے حکم کی تعمیل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

"تم جاؤ، جلدی کپڑے بدل کر یہیں آ جاؤ۔" اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے جانے کو کہا۔

"ٹھیک ہے اُستاد۔" اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد اس شخص نے سامنے رکھے جگ سے پانی کا گلاس بھر کر پینا شروع کر دیا۔ وہ شاید کچھ وقت گزار رہا تھا کہ وہ لڑکا بھی اس کی محفل میں آجائے تو وہ لڑکی کہاں شروع کرے۔ کچھ ہی دیر میں وہ لڑکا صاف سترے کپڑے پہنے کمرے میں داخل ہوا اور دوسرے لڑکوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ اب وہ شخص کے بچے اُستاد کہہ رہے تھے، اپنی بات سمجھنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

"ہاں تو میں تم لڑکوں کو اپنی زندگی کی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔" وہ اداسی سے چہمت کو گھورتا ہوا بولا۔ پھر اس کی ٹاہیں ادھر ادھر گھومیں

ایک روز.....
"کیا ہوا ایک روز.....؟" استاد نے سانس لینے کے لیے خاموشی اختیار کی تو اسلم فوراً بول پڑا۔

"میرے لیے ہر جانب اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور مجھے اُجالے کی تلاش تھی اس لیے میں نے ایک رات خاموشی سے اپنا گھر چھوڑ دیا۔"
"ارے....." ارسلان نے اپنا سر کھجاتے ہوئے اسس سے کہا۔
"میرا خیال تھا کہ میں گھر سے باہر نکل کر اجالوں کی تلاش میں کام یاب ہو جاؤں گا لیکن ایسا ممکن نہ ہوسکا۔" اس نے مزید کہا شروع کیا۔ "اپنا شہر چھوڑ کر میں دُور ایک چھوٹے شہر میں آ گیا۔ میری عمر کوئی پندرہ برس ہوگی۔ سوچا تو کچھ اور تھا لیکن یہاں تو میرے لیے رہنا اور جینا ہی دشوار ہو گیا۔ ہر ایک شک کی نظر سے دیکھتا، کوئی مجھے شہر ادا دینے پر تیار نہ ہوا۔ ہر کوئی ضمانت مانگتا، میں بھلا اجنبی شہر میں کس کا حوالہ دیتا۔"

"ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا تھا۔" دو تین لڑکوں نے سرگوشی میں بات کی۔

"ایک روز میں پارک میں پرانی ڈبل روٹی کے ٹکڑے جمع کر کے کھا رہا تھا کہ ایک ہم درو شخص میری جانب آیا۔ اس نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ ہوٹل لے جا کر خوب پیٹ بھر کر روٹی

اور بچوں کی جانب مرکوز ہو گئیں۔
"ہم آپ کی کہانی سننے کے لیے بے تاب ہیں۔" ایک لڑکے نے اچک کر کہا۔

"میں جہاں پیدا ہوا وہاں ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا لیکن ہمارا گھر اندھیرا تھا۔ بہت سخت تھا۔ ہم نرمی کی نعمت سے محروم تھے۔" وہ پھر منہ مڑ کر ہانسی میں کھو گیا۔

"یہ تو واقعی المیہ ناک ہے۔" ایک لڑکا سادگی سے بولا۔

"بات باج پر غصہ کرنا میرے گھر والوں کی عادت تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مارا اور سردینا جانے لگیوں ان کے مزاج میں شامل تھا۔ میں امی اور ابو کے تحت دوسرے سے تو پریشان تھا ہی، اوپر سے بڑے بھائی نے میرے جینے کا مقصد فوت کر کے رکھ دیا تھا۔" یہ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل آئے۔

"اوہ استاد!" نے آنے والے لڑکے کے منہ سے ہم دردی میں یہ لفظ نکلا۔

"میں پڑھنا چاہتا تھا لیکن بڑا بھائی علم کی دولت سے محروم تھا، اس لیے وہ میری پڑھائی میں بھی رکاوٹ بننے لگا۔ میں ضد کرتا تو اس کے ہاتھ چلتے۔ وہ والد صاحب کی دکان چلا رہا تھا اور انھیں خوب کما کر دیتا تھا اس لیے وہ اسے کچھ نہیں کہتے تھے۔ وہ مجھ سے بھی یہی

چاہتا تھا کہ پڑھائی چھوڑ کر اپنے باپ کا پرچوں کا کام سنبھالوں۔" استاد کی کیفیت دیکھنے والی تھی۔
"پھر کیا ہوا استاد؟" ایک لڑکے نفیس نے سوال کیا۔

"میں وہی بنا رہا ہوں۔ مجھے تعلیم چھوڑنا گوارا نہیں تھا۔ بات بے بات بھائی جان نے مار مار کر میرے دل میں اپنے خلاف نفرت پیدا کر دی تھی۔ ماں کی طرف دیکھتا تو وہ بھی اسے کچھ نہ کہتی۔ والد صاحب کا رویہ تو میں بتا ہی چکا، یوں لگتا تھا جیسے وہ ان ہی کے کہنے پر مجھ پر ظلم توڑ رہا ہو۔ میں آخر ظلم کب تک برداشت کرتا۔



کھلائی، پھر سوال و جواب کیے۔

"کتنا اچھا آدمی تھا وہ....." راضیل نے استاد کی طرف دیکھ کر کہا لیکن استاد نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

"بہ ظاہر تو وہ شخص بہت اچھا تھا لیکن مجھ پر مہربانی سے پیش آ کر وہ مجھے اپنے ٹھکانے پر لے گیا، جہاں مجھ جیسے بہت سارے لڑکے موجود تھے۔ معصوم بچوں کو بھلا پھسلا کر یہاں لے آتا اور پھر ان سے بھیک منگواتا اس شخص کا کام تھا۔ اس نے مجھے کچھ دن اپنے پاس رکھ کر اس مہم پر لگا دیا۔"

"دیکھو تو استاد کی کہانی مجھ سے کتنی ملتی ہے۔" ایک لڑکے نے دوسرے کے کان میں کہا۔

"گھر بار چھوڑ کر میں تو پڑھائی اور اچھے مستقبل کی خاطر لگا تھا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ باہر نکل کر تو انسان بڑی بڑی مصیبتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مجھے اپنے گھر کے ماضی کے معاملات اب معمولی لگنے لگے تھے۔"

"ہاں وہ تو ہے۔" نفیس نے لقمہ دیا۔

"میرا پڑھنے لکھنے کا خواب اور بڑا آدمی بننے کا عزم بکھر کر رہ گیا۔ میں نے ان لوگوں کی بڑی منت ساجت کی۔ دو تین بار بھاگنے کی کوشش بھی کی لیکن کوئی ترکیب کارگر ثابت نہ ہوئی۔" ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ لڑکے بھی استاد کی کیفیت دیکھ کر اس ہو گئے۔ استاد کے ساتھ رہتے ہوئے ان لڑکوں میں سے کسی کو مہینا اور کسی کو سال ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں استاد نے کبھی کسی کو اس طرح ساتھ بٹھا کر بات نہیں کی تھی۔ استاد کا رویہ سخت ہوتا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور لڑکوں کو ان کی حد تک رکھتا کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ اس سے چوں چال بھی کر جائیں۔ اس استاد کی خاص وجہ سے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کر رہا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ میں ان کے ساتھ رہ رہ کر پہنچتا ہوتا گیا۔ بھیک مانگنے میں جہاں میں شرم کرتا یا ہاتھ نہ پھیلاتا تو ان کے پھیلائے ہوئے ہر کارے جو ہم مانگنے والوں پر نظر رکھتے تھے، فوراً سیدھا کر دیتے۔ آخر کار میں بھیک مانگنے میں ایسا طاق ہو گیا کہ سب جیسے زیادہ دیکھ کر لڑنے لگے۔

"پھر تو وہ بہت خوش ہوئے ہوں گے۔" ایک لڑکے نے سوال کیا۔ "لاڑی کی بات ہے، وہ مجھ پر بہت اعتماد کرنے لگے۔ میں

سب کچھ بھول بھال کر ان کا سو کر رہ گیا۔"

استاد نے لڑکے کی بات کا جواب دیا۔

"آپ کو کبھی گھر کی یاد نہیں آئی۔" صفدر نے انتہائی معصومیت کے ساتھ کہا۔ اسے تو اپنے ماں باپ روز یاد آتے تھے مگر وہ بھی مجبور تھا۔ "گھر سے پریشان ہو کر بھاگا تھا، اس لیے اس گھر کی جانب سے غافل بنی دنیا میں ایک دم گمن ہو گیا۔"

"کبھی ماں باپ کی یاد آئی.....؟"

"ابتدا میں تو ماں بہت یاد آئی لیکن کیا کرتا، اب تو میں یہاں سے نکل بھی نہیں سکتا تھا۔" وہ اداسی سے بولا۔ "دقت کے ساتھ ساتھ میں بڑا ہوتا گیا اور اپنی فیلڈ کا ماسٹر بھی ہو گیا۔ میرے استادوں میں سے دو ایک انتقال کر گئے۔" "پھر.....؟"

"مجھے موقع مل گیا تو میں ان سے الگ ہو گیا۔" وہ کچھ خوش رہا ہوا۔ "میں نے اپنا کام الگ کر لیا۔" "اچھا....."

"میں بھی مزدوروں اور ریلوے اسٹیشن یا دیگر جگہوں پر ایسے بچوں کو تلاش کرتا جو گھر سے بھاگ کر آئے ہوں اور کسی سہارے کی تلاش میں ہوں۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک ٹیکری آئی اور پھر سنجیدگی میں بدل گئی۔ "میں نے اپنے بھائی کی مار کا بدلہ یوں لیا کہ تم لوگوں کو پیار سے بھلا پھسلا کر یہاں لانا رہا اور بھیک مانگنے پر لگا رہا۔" اب اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اسے شاید اپنے بچے پر پہنچتا ہوا تھا۔

"ایسا کرتا گناہ ہے ناں اکل" ننھا یا سر جو کچھ دنوں پہلے ہی اس مہم کا ممبر بنا تھا، انتہائی معصومیت سے بولا۔ اس کے اس سوال پر استاد نے اسے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"بالکل گناہ ہے مگر مجھے اپنی خوشیاں چھین جانے پر اس کا بدلہ دوسروں سے لینا دوسروں کے گھروں کے چراغوں کو ٹل کر دینا کہاں کی انسانیت ہے۔" اس کے اندر کا انسان جاگ چکا تھا۔ "میں نے اپنا بڑی زندگی سے سبق نہیں سیکھا تھا اس لیے اس ذل و ذل (دولت) میں آ رہا تھا کیا اور ان بات پر مجھے کوئی ندامت بھی نہیں تھی۔" اس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔

"میں نے پچھلے چند ہفتوں میں دو چار ایسے گھرانے دیکھے جہاں بڑے بھال اپنے چھوٹوں سے بہت پیار سے پیش آتے ہیں۔" (بقیہ حصہ صفحہ نمبر 59 پر ملاحظہ فرمائیں)



پیشا شروع کر دیتے اور بار بار ہاتھ دھو کر کھانا بھی کرتے..... "ویل،
لوٹنے کی ماں کی ویل" رہ رہ کر پکارتے۔

تقریب کے ختم ہونے تک نہ صرف مہر بی بی، بلکہ اسی کی طرح
کی اور بہت سی کم زور دل و دماغ والی بیبیاں سر باندھ کر ادھر ادھر پڑی
کراہ رہی تھیں۔ پورا دن سر کے درد کے مارے تڑپ تڑپ کر گزرا۔
شام تک لاکھ جتن کر کے خالہ مہر بی بی کو کچھ افادہ ہوا اور وہ بیٹے کی
ہارات کے ساتھ خانے کے قابل ہوئیں۔ لڑکیوں نے پوچھا: "خالہ!
کیا بارات کے ساتھ ڈھول نہیں جائیں گے؟"

تو خالہ نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"ما بابا! ڈھول بس دور ہی کے سہانے!"



دوسرے محلے میں کسی کی شادی تھی اور بڑے زور و شور سے
ڈھول بجایا جا رہا تھا۔ خالہ مہر بی بی بڑے شوق سے ڈھول کی آواز سن
سن کر خوش ہو رہی تھیں اور محلے کی لڑکیوں کو بلا بلا کر کہہ رہی تھیں:
"ادھر آؤ، ڈھول کی تال پر لڑی ڈالو، جب افضل کی شادی ہوگی تو
میں بھی ایسا ہی ڈھول منگواؤں گی تو تم سب لڑی ڈالنا۔"

بچوں کو بس ایک شغل چاہیے تھا۔ وہ سب خالہ مہر بی بی کے محن
میں اکتھیں ہو کر لڑی اور بھنگا ڈالنے لگیں۔ ڈھول کہیں بج رہا تھا، لڑی
کہیں ڈالی جا رہی تھی مگر دور سے ڈھول کی آواز بہت اچھی لگ رہی تھی۔
جب مہر بی بی کے بیٹے کی شادی کا موقع آیا تو مہندی کی رسم پر
اس نے اپنا چادر پورا کر کے لے لے ڈھول والوں کو بلوایا۔ بڑے
بیٹے ڈھول بگڑے میں لگائے دو ڈھول والے آ موجود ہوئے۔

ڈھول کی گونج اور تھاپ پر پہلے لڑکوں نے پھر لڑکیوں نے خوب
لڑی ڈالی، مگر آج نے چاری خالہ مہر بی بی کو اپنے ہاں بچے والے
ان ڈھولوں کی آواز کچھ ایسی خوش گوشت نہیں لگ رہی تھی۔ ان کی
"دھم دھام" کی کرخت اور زور دار گونج سے جیسے دل و دماغ پر
ایک چھڑی پڑی محسوس ہوتی۔ اس پر بڑے کی بات یہ تھی کہ
ڈھول والے شاید دولہا کی ماں کو اپنے گھر کے بیٹا ہرنے سے زیادہ
ی متاثر کرنا چاہتے تھے کہ وہ بے جا قریب میں جہاں بھی جا کر
چلتی، ڈھول والے اس کے سر پر جا بیٹھتے اور زور و شور سے ڈھول



پھل دار درخت

عزت کرتے۔ اس سے محبت کرتے تھے کیوں کہ وہ ہر کسی کے کام آیا کرتا تھا۔ وہ بات بھی کھری اور صاف صاف کرتا۔ جھوٹ کے قریب بھی نہ پہنچتا۔ اس کا اس بات پر پختہ یقین تھا کہ جھوٹ بولنے سے گھر سے رحمت اور برکت دونوں اٹھ جاتی ہیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ لکڑہارا جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ اس نے کہیں سے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور پوری توجہ سے ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگا۔ آواز کسی بچے کی معلوم ہو رہی تھی جو سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ عبداللہ رحمہ اللہ دل تو تھا ہی، فوراً کام چھوڑ کر بچے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ جھاڑیوں اور درختوں کو غور سے دیکھتا ہوا آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ تھوڑی ہی دُور اس نے جھاڑیوں کے قریب ایک بڑے سے درخت کے پیچھے دیکھا تو ایک بچہ تھا جو آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ درخت سے ٹپک لگائے اوکھ رہا تھا۔ شاید رونے روتے تھک کر نڈھال ہو گیا تھا۔ عبداللہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس قدر خوب صورت اور پیارا بچہ اس نے ساری بستی میں نہیں دیکھا تھا۔ ”سبحان اللہ“ اس کے دل نے بے اختیار اپنے رب کی تعریف کی، جس نے اس بچے کو ایسی پیاری صورت سے نوازا رکھا تھا۔

بہت سال گزرے، ایک بستی میں ایک لکڑہارا رہتا تھا جو بہت نیک اور صابر و شاکر تھا۔ اس کا معمول تھا کہ صبح سویرے اذان کی آواز پر اٹھ جاتا۔ وضو کر کے مسجد کو چل دیتا جہاں نماز ادا کر کے کچھ دیر کے لیے قاری صاحب سے قرآن پاک پڑھنا، پھر اس کا ترجمہ پڑھنے کی کوشش کرتا۔ کوئی گھنٹے بھر کے بعد جب مسجد سے گھر آتا تو اس کی بیوی اس کا ناشتا تیار کر چکی ہوتی۔ ناشتا کیا ہوتا، بس دو پراٹھے اچار کے ساتھ اور قریبی جنگل کی طرف نکل کھڑا ہوتا، جہاں خوب لکڑیاں کاٹ کاٹ کر جب تھک جاتا تو پھر کسی درخت کے سائے میں آ بیٹھا۔ قریب ہی ندی کا صاف شفاف پانی بہہ رہا ہوتا۔ لکڑہارا آرام سے اپنا ناشتا کھول کر رومال زمین پر بچھا دیتا اور نہایت مزے سے ناشتا کرتا، پھر اللہ کا شکر ادا کر کے ذرا دیر کو سستا لیتا۔ کچھ دیر کے بعد جنگل میں گھوم پھر کر جنگل پھل اور میوے اکٹھے کرتا۔ دوپہر ہونے سے پہلے پہلے واپس آ کر لکڑیاں بازار میں فروخت کر کے گھر آ جاتا۔ گھر آ کر سارے پیسے اپنی بیوی کو ہاتھ دیتا اور میوے بچوں کو دے دیتا۔ وہ اپنا شام کا وقت بستی کے لوگوں کے دکھ سکھ میں گزار دیتا، ساتھ ہی ساتھ مسجد میں نمازیں بھی ادا کر دیتا۔ بستی کے سارے بڑے بوڑھے عبداللہ لکڑہارے کی بہت

عبداللہ اس کے قریب گیا۔ گھاس پہ چلتے ہوئے جب سوکھے پتوں سے چرچر کی آواز نکلی تو بچے کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے عبداللہ کو دیکھنے لگا۔

لکڑہارے نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو بچہ اس سے لپٹ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنی خالہ کے گھر جا رہا تھا جو جنگل کے دوسری طرف ایک گاؤں میں رہتی ہے۔ نجانے کس طرح وہ جنگل میں راستہ بھول کر ماں سے پھڑ گیا اور اسے تلاش کرتے کرتے تھک کر اب یہاں بیٹھا اپنی بے بسی اور بے چارگی پہ آنسو بہا رہا تھا۔ وہ عبداللہ کے ساتھ اس کے گھر چلنے کو تیار ہو گیا۔ گھر آ کر وہ عبداللہ کے بچوں میں گھل مل گیا۔ عبداللہ کی بیوی بھی بہت نیک فطرت عورت تھی، اس نے بھی بچے کو خوب پیار کیا۔ یہ سوچ کر اس کا دل بھی پریشان ہو گیا کہ نجانے کس ماں کا بیٹا اس سے پھڑ گیا ہے۔ یوں پیار محبت کی چھاؤں میں وہ پلنے لگا۔ بچے نے اپنا نام شان بتایا۔ وہ تھا بھی بڑی آن بان اور شان والا۔ چند ہی روز میں سب گھر والوں نے محسوس کیا کہ شان اچھی عادتوں کا مالک نہیں ہے۔ وہ اپنی شکل و صورت پر ناز کرتا، غریبوں سے دور بھاگتا اور امیر بچوں کی خوشامد کرتا، جب کہ عبداللہ کے بچے اس سے مختلف تھے۔ وہ شکل و صورت کے لحاظ سے تو عام سے بچے تھے لیکن اچھے اخلاق اور اعلیٰ اوصاف کے مالک تھے۔ عبداللہ جب بھی شام کے وقت بستی کے بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتا تو شان کی کسی نہ کسی بُری عادت کے باعث اسے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

ایک روز تو حد ہی ہو گئی۔ بستی کا ایک لڑکا بوٹا روتا ہوا عبداللہ کے پاس آیا اور بتایا کہ شان اسے اپنے ساتھ کھیلنے نہیں دیتا حالاں کہ بوٹے نے کھیل میں کبھی بے ایمانی نہیں کی، کسی کو الٹے سیدھے نام سے بھی نہیں پکارا۔

عبداللہ فوراً اس کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور اسے پیار کرتے ہوئے دلاسا دیا کہ میں شان سے جا کر بات کرتا ہوں، وہ تمہیں ضرور کھیلانے گا۔ شان سے جب بات ہوئی تو اس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

”ابا! میں اسے ہرگز نہیں کھیلنے دوں گا۔ دیکھتے نہیں اس کا رنگ کتنا کالا ہے بالکل اس جیسا۔“ اس نے درخت پر بیٹھے کوے

کی طرف اشارہ کیا تو دوسرے لڑکے ہنس پڑے۔

”شان پتر! ایسا تو نہ کہو۔ یہ رنگ و روپ تو اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں۔ اس پر کسی انسان کا کیا اختیار ہے۔“ لکڑہارا دل ہی دل میں کانپ اٹھا۔ شان بوٹے کی طرف دیکھ کر اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ ”ابا! جس کی سفارش لے کر تو آیا ہے ناں، یہ اندر سے بڑا کھوٹا ہے۔ ہر ایک سے نمبر بنانے کی خاطر ملتا ہے اور ایسے ظاہر کرتا ہے کہ جیسے اسے سب سے عزیز وہی ہے۔“ شان نے ایک نفرت بھری نگاہ اس پہ ڈالی۔

”یہ تو اس کا اعلیٰ اخلاق ہے، بھئی!“ عبداللہ نے پیار سے بوٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ عبداللہ جانتا تھا کہ بوٹا پانچ وقت کا نمازی ہے، وہ اسے اکثر مسجد میں نظر آتا رہتا تھا۔

”اخلاق.....؟“ وہ بھی اعلیٰ اور اس کا لے کلوٹے کا؟“ شان نے بڑے غرور سے بیٹ کو ہوا میں لہراتے ہوئے بوٹے کو دیکھا جو سہم کر عبداللہ کے پیچھے ہو گیا۔ شاید اسے لگا کہ شان اسے بیٹ مارنے لگا ہے۔ بوٹے کی اس بے اختیار گھبراہٹ پر شان کو بہت لطف آیا اور اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

عبداللہ خاموشی سے گھر لوٹ آیا۔ ”کاش میں مجھے پتا ہوتا کہ یہ اتنا مغرور اور بد دماغ ہے تو میں کبھی گھر نہ لاتا۔“ وہ سوچوں میں ڈوبا ہوا، چپ چاپ مسجد کی طرف چل دیا کہ مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ بوٹا بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلتا ہوا آ رہا تھا، بجھے دل اور بوجھل قدموں سے۔ عبداللہ نے مسجد کے قریب جا کر بوٹے کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

”بوٹے پتر! تو دل میلانہ کر، میں کل جنگل سے تیرے لیے لکڑی کی تلواریں بنا کر لاؤں گا، پھر تم میرے بچوں سے کھیلا کرنا اور شان کے لیے بھی دعا کرنا۔ میں بھی دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ اس میں عاجزی پیدا کر دے۔ اس کے اخلاق بھی اچھے کر دے۔ پتر! انسان اعلیٰ اخلاق اور اچھے اعمال سے بڑا بنتا ہے، رنگ پر فخر سے نہیں۔“

سیانے کہتے ہیں کہ جتنا کوئی جھکتا ہے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ اسے عزت دیتا ہے۔“ عبداللہ نے بوٹے کے شانے تھپتھپاتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔ بوٹا اپنا سارا نوکھ بھول کر تلواروں کے شوق میں جلدی سے مسجد کے اندر بھاگ گیا۔ عبداللہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا اور دعا کرتا رہا۔ کاش!

شان بھی اسی طرح نمازی بن جائے، اسی طرح
پیار اور محبت کرنے والا اور بڑوں کا ادب کرنے والا
بن جائے۔

اس بات کو سات آٹھ دن بھی نہ گزرے
تھے کہ ایک دن اچانک شان کو خارش شروع ہو
گئی۔ بس پھر کیا تھا، ہستی کے دوسرے بچوں
نے اس کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیا۔ ہلکے
جیسے ہی وہ کھیلنے کے لیے گھر سے باہر نکلا،
لڑکے اس سے دور بھاگ جاتے اور کہتے
جاتے۔ ”بھاگوا بھاگوا خارش آگیا، خارش آ
گیا۔“ شان دل ہی دل میں بچ و تاب کھا کر
رہ جاتا مگر کچھ کر نہ سکتا۔

عبداللہ نے گاؤں کے حکیم صاحب سے
اس کا علاج تو کر دیا مگر خاص افادہ نہ ہوا۔

خارش کی وجہ سے اس کے تمام دوست اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔
البتہ ایک بونا تھا جو روزانہ عصر کی نماز پڑھ کر اس کے گھر آتا اور
اس کے ساتھ مغرب کی نماز تک وقت گزارتا۔ اسے تسلی دیتا اور اس
کے لیے دعا کرتا اور شان دل ہی دل میں شرم سار تھا۔

اس دن جمعہ تھا، عبداللہ اور اس کے بچے بھاگتے ہوئے پڑھنے
کی تیاری کر رہے تھے۔ عبداللہ کی بیوی نے شان کو بھی نہانے کا کہا
اور اس کے کپڑے غسل خانے میں رکھ آئی۔ شان نے نہا کر کپڑے
بدلے اور کنگھی کرنے کے لیے تخت شیشے کے سامنے کھڑا ہوا تو شیشے
پہ نظر پڑتے ہی اس کی ایک چیخ سی لکل گئی۔ یہ وہ شان تو نہ تھا۔ اس
کا چہرہ عجیب وحشت زدہ سا لگ رہا تھا۔ خارش کرنے سے اس کے
چہرے پر جگہ جگہ دانے لکل آئے تھے اور خراشیں بھی پڑ گئی تھیں۔

عبداللہ جو وضو کرتے ہوئے اس کو بھی دیکھتا جا رہا تھا اور اس
کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اب جو اس کی آنکھوں سے آنسو
بہتے دیکھے تو پاس آ کر محبت سے بولا۔ ”شان پترا بونا یاد رہا ہے
ناں.....؟ تم نے اس کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا اب تمہیں
احساس ہو ہی گیا ہے تو پھر آؤ مسجد چلتے ہیں، نماز جمعہ ادا کرو۔
اپنے رب سے اپنے غم کو اور تکبر کے لیے توبہ کرو اور بولے سے



بھی گلے ملو۔ مجھے اپنے اللہ کی رحمت پر پورا بھروسہ ہے، دو تمہیں
خارش سے نجات ضرور دے گا۔ حکیم صاحب کہہ رہے تھے کہ دوا
اور دارو تو میں کر رہا ہوں مگر آپ لوگ دعا بھی کریں۔ اللہ پاک
رحمت کر دیں گے۔“ عبداللہ پیار سے آہستہ آہستہ بولتا رہا، شان
بے قراری سے عبداللہ کے گلے لگ گیا۔

”اہا! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تیرا دل دکھایا ہے۔ اور بونا.....!
اس نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اللہ مجھے اس مرض سے آرام
دے دے تو پھر دیکھئے گا کہ میں ایک نیا انسان بن جاؤں گا اور ہاں!
آج میں بھی جمعہ پڑھنے جاؤں گا۔ آج کے بعد تو مجھے نمازی ہی دیکھنے
گا، اللہ کے فضل سے۔“ شان نے ایک عزم سے وعدہ کیا۔

عبداللہ خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بولا۔ ”شان پترا! بیٹا نے
کہتے ہیں کہ پھل دار شاخ ہمیشہ جھکی ہوتی ہے جب کہ غنڈ منڈ شاخ
اکڑی رہتی ہے۔ تم پھل دار شاخ بنو بیٹا! جو جھکی ہی رہتی ہے،
دوسروں کو پھل بھی دیتی ہے اور فائدہ پہنچاتی ہے۔“

جو غالی ظہر ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کر ملتے ہیں
صرافی سرنگوں ہو کر ہمارا کرتی ہے پیانہ





لیکن کام کوئی آتا نہ تھا۔ ناچار منہ پر کپڑا لپیٹ کر منڈی میں گیا کہ مزدوری ہی کر لوں لیکن وہاں پہلے ہی مزدوروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اسے کسی نے کام نہ دیا۔

حیران پریشان در پہ در، خاک بہ سر پھر رہا تھا کہ ایک بوڑھے آدمی پر نظر پڑی جو بڑا قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا۔ غور سے دیکھا تو شکل جانی پہچانی سی لگی۔ قریب گیا تو خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ اس کا رشتے کا چچا شیخ عبدالحمید تھا جو تجارت کے سلسلے میں عموماً شہر سے باہر رہتا تھا اور برسوں میں ایک آدھ بار ہی اس کے گھر آتا تھا۔

حاکم دوڑتا ہوا شیخ کے پاس گیا اور بڑے ادب سے اسے سلام کیا۔ بوڑھے شیخ نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور تعجب سے بولا: "ارے حاکم! تم؟ مگر تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

حاکم نے چچا کو اپنی دکھ بھری کہانی سنائی اور پھر سر جھکا کر بولا: "افسوس! مجھ سے زیادہ بد نصیب انسان دنیا میں کوئی نہ ہو گا۔"

شیخ عبدالحمید چپ چاپ حاکم کی پشیمانیار ہا اور جب وہ خاموش ہوا تو بولا: "خیر، جو ہوا سو ہوا۔ کوشش براصلو، آئندہ راز احتیاط اب تم میرے ساتھ چلو اور کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ اگر تم نے محنت و دیانت سے کام کیا اندری محبت میں نہ پڑے، شریفیوں کی طرح رہے

پرانے زمانے کی بات ہے، ملک شام کے ایک شہر حمص میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ اس کا ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام حاکم تھا۔ سوداگر نے دن رات محنت کر کے پائی پائی جمع کی تھی اور اب اس کا شمار حمص کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس پر بھی وہ بہت سادہ زندگی بسر کرتا اور حاکم کو بھی حد سے زیادہ پڑھنے نہیں دیتا تھا۔

جب سوداگر کا انتقال ہوا تو اس کی ساری جائیداد حاکم کو ملی۔ اتنی دولت پا کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور وہ اپنے باپ کی خون پسینے کی کمائی دونوں ہاتھوں سے لٹانے لگا۔ اس کی حویلی میں دن رات خوشامدی دوستوں کا مجمع لگا رہتا۔ روز شہر کے کسی نہ کسی امیر آدمی یا سرکاری افسر کی دعوت ہوتی جس پر وہ دل کھول کر پیسہ خرچ کرتا۔ آہستہ آہستہ سارا جمع جتنا ختم ہونے لگا اور ایک دن وہ بھی آیا جب اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ رہی۔

جب اس کے دروازے پر فاقوں نے دستک دی تو اس نے جائیداد بیچنی شروع کر دی لیکن کچھن وہی رہے۔ فضول خرچی میں کمی نہ کی۔ چٹاں چہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ دھیرے دھیرے تمام جائیداد ہک گئی اور وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ دو تین تاتے کیے تو ثانی یاد آ گئی۔ سوچا کوئی کام کر دوں اور کسی طرح پیسے کا دوزخ بھروں

چاہیے تھی لیکن ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اداسی کا سبب بنا دوں تو تم اس دکھ درد سے محفوظ رہو جس میں ہم ساری زندگی بسر رہے۔ اتنا کہہ کر شیخ دارا سا اٹھا، گاؤں کے سے کمرنگی اور پھر سامنے ایک بھاری بند دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا: "یہ دروازہ کبھی مت کھولنا۔ اگر تم نے میری نصیحت نہ مانی تو تبارا بھی وہی حال ہوگا جو ہمارا ہوا۔" یہ کہہ کر شیخ نے زور کی ہنگی لی اور پھر اپنی جان، جان پیدا کرنے والے کے سپرد کر دی۔

شیخ عبدالحمید کی وفات کے بعد اس کی جائیداد کا وارث حاکم بنا اور وہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگا۔

ایک دن حاکم اس دروازے کے پاس سے گزرا جسے شیخ عبدالحمید نے کھولنے سے منع کیا تھا۔ اسے اپنے بچپن کے وہ الفاظ یاد تھے جو اس نے مرتے وقت کہے تھے لیکن وہ اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے سوچا، دیکھوں تو اس دروازے کے اندر ایسی کیا چیز ہے جسے دیکھنے سے اس کے بچپن کے منع کیا تھا۔ اس کے دماغ نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا اور دروازہ کھول کر اندر نظر ڈالی۔

دروازے کے ساتھ پتھر کی میزھیاں تھیں جو ایک لمبی سی سرنگ میں جاتی تھیں۔ اس سرنگ کے آخری سرے پر مدھم مدھمی روشنی ٹمٹم رہی تھی۔ حاکم کے پاؤں نے اختیار میزھیاں طے کرنے لگے۔ اب دوسرے سرے کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ یہ سرنگ ایک لمبے چوڑے میدان میں اٹھتی تھی۔ وہ اس لٹری ووق میدان میں کھڑا اور اوجھر دیکھ رہا تھا کہ سامنے سے اونٹوں کا ایک قافلہ آتا دکھائی دیا۔ یہ چار اونٹ تھے۔ تین اونٹوں پر تین آدمی سوار تھے اور چوتھا خال تھا۔

اونٹ قریب آئے تو حاکم کی آنکھیں حیرت سے پھٹی گئیں۔ جن سواروں کو وہ مردہ سمجھ رہا تھا، وہ عورتیں تھیں جو شکل سے پرستان کی پریاں یا جنت کی حوریں لگ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک عورت پیچھے آگئی، اس نے خال اونٹ پر حاکم کو اٹھایا اور پھر یہ قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے عورتوں سے استہزا پوچھا کہ وہ اسے کہاں لے جا رہی ہیں لیکن وہ مسکراتی رہیں۔ وہیں پہنچیں۔

چند گھنٹوں کے سفر کے بعد یہ قافلہ ایک تاریک خوبصورت اور صاف ستھرے شہر میں پہنچا۔ یہاں ہر طرف چمک چمک تھی۔ لوگ ہاتھ اپنے اپنے کام کا مین مشغول تھے۔ ہر شخص کے چہرے پر

تو دنیا کا کوئی دکھ تہمارے پاس تک نہ پہنچ سکے گا۔"

اندھا کیا چاہے؟ وہ آنکھیں۔ حاکم راضی ہو گیا اور شیخ عبدالحمید اسے اپنے گھر لے گیا۔ گھر کیا تھا، پورا محل تھا جس میں بیس بیچیس کمرے، بڑے بڑے دالان اور آگے پیچھے پھل وار درختوں کے خوش نما باغ تھے۔ انہی دالانوں اور غلام گروہوں سے گزرتا ہوا وہ ایک دالان میں پہنچا تو حیرت نے اس کے پیچ پکڑ لیے۔ بھوپکا سا کھڑا کھڑا رہ گیا۔ اس دالان میں چار بڑے بڑے ایک دائرے میں سر جھکائے بیٹھے تھیں کر رہے تھے۔ وقتے وقتے سے سر اٹھا کر ایک لمبی غنڈی آہ بھرتے اور پھر سر جھکا کر رونے لگتے۔ شیخ عبدالحمید نے ان بوڑھوں کی طرف افسردہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر خود بھی انہی کی طرح آہ بھر کے حاکم سے بولا:

"تم میری اور ان بوڑھوں کی دیکھ بھال کرو گے۔ ضرورت کی ہر چیز ہمیں وقت پر ملتی رہے۔ ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو لیکن ایک بات کا سختی سے خیال رکھنا۔ کبھی بھول کر بھی یہ نہ پوچھنا کہ ہم آہ و زاری کیوں کرتے ہیں۔ بولا! وعدہ کرتے ہو؟" حاکم نے وعدہ کر لیا، حال آں کہ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ یہ بوڑھے جنہیں دنیا کی ہر چیز میسر ہے، اتنے زنگی کیوں ہیں!

دن گزرتے گزرتے بوڑھے روتے رہے اور حاکم ان کی خدمت کرتا رہا۔ شیخ عبدالحمید ان سے بہت خوش تھا۔ اس نے وصیت کر دی تھی کہ اس کے بعد اس کی ساری جائیداد کا وارث حاکم ہوگا۔

دو سال اسی طرح بیت گئے۔ بوڑھے اب بہت کم زور ہو گئے تھے اور ان کے چل چلاؤ کا وقت آگیا تھا۔ ایک دن صبح کو حاکم سوکر اٹھا تو معلوم ہوا کہ ایک بوڑھا اس دنیا سے کوچ کر گیا ہے۔ ایک ہفتے بعد دوسرا بوڑھا بھی چل بسا اور دس پندرہ دن بعد باقی دونوں بوڑھے بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اب حویلی میں صرف حاکم اور شیخ عبدالحمید رہ گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد شیخ بھی بیمار ہو گیا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ یہ دیکھ کر حاکم نے اس سے کہا: "چچا جان، میں نے اب تک آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ کبھی یہ نہ پوچھا کہ آپ اور آپ کے ساتھی اتنے ادا اس اور غم گین کیوں رہتے ہیں لیکن اب آپ کا آخری وقت آگیا ہے۔ خدا را اب تو بتا دیجیے کہ آپ لوگ اتنے دیکھی کیوں تھے؟"

شیخ عبدالحمید آہ بھر کر بولا: "بیٹا، تمہیں یہ بات نہیں پوچھنی



اب وہ ایک چاند سے بیٹے کا باپ تھا۔ اس کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برأت تھی۔ مگر تھی ایسے کوئی غم۔ بس ایک چیز دل میں کھلکتی رہتی تھی۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس دروازے کے اندر کیا ہے جسے کھولنے سے ملکہ نے منع کیا تھا۔

ایک دن اس دروازے کے پاس سے گزرا تو ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ میں نے اپنے چچا کا کہا نہ مانا تو اس جنت میں پہنچ گیا۔ اگر میں ملکہ کا کہا نہ مانوں تو ہو سکتا ہے ایسی جنت میں پہنچ جاؤں جو اس سے بھی اچھی ہو۔ یہ سوچ کر اس نے دروازے کا کھڑا پکڑ کر کھینچا۔ دروازہ ہلکی سی چڑچاہٹ سے کھل گیا۔ اس دروازے کی سیڑھیاں بھی ایک لمبی سی سرنگ میں جاتی تھیں اور اس سرنگ کے آخری سرے پر بھی مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر سرنگ کے آخری سرے تک گیا اور جب باہر نکلا تو سرنگ ایک دم غائب ہو گئی۔ اب وہ ایک میدان میں کھڑا تھا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا تو ہر چیز جانی پہچانی نظر آئی۔ وہ اپنے شہر حص میں پہنچ گیا تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ وہ بوڑھے کیوں ہر وقت روتے پیتے رہتے تھے۔ اب اس کی زندگی بھی روتے دھوتے ہی گزرے گی۔ وہ اپنے اس گھر بار اور بیوی بچوں کو یاد کرتا جو اس جنت میں چھوڑ آیا تھا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔ اسی طرح روتے دھوتے ایک دن وہ مر گیا اور اس دروازے کا راز بھی اپنے ساتھ ہی قبر میں لے گیا۔

مسکراہٹ تھی اور ہر شخص مطمئن اور خوش حال نظر آتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ تالہ ایک عالی شان محل کے دروازے پر جا کر رک گیا۔ تینوں عورتیں اونٹوں پر سے اتریں اور حاکم کو محل کے اندر لے گئیں۔ وہ محل کی ایک ایک چیز کو دیکھتا اور حیرت سے دانتوں تلے انگلیاں دبالتا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی سہانا پہنا دیکھ رہا ہو۔

عورتیں خوب صورت باغات، پھولوں کے حسین و جمیل تختوں اور ان کے درمیان چلتے ہوئے خوش نما فواروں کے پاس سے گزرتی ہوئی حاکم کو ایک بڑے سے کمرے میں لے گئیں، جہاں ایک بڑے سے ہونے کے تحت پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس نے حاکم سے کہا: ”ہم تمہیں اپنی سلطنت میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ یہاں ہم عورتوں کی حکومت ہے اور ہم نے اسے جنت بنا دیا ہے۔ یہاں نہ کوئی چوری کرتا ہے، نہ ڈاکا ڈالنا ہے۔ ہر شخص کو ضرورت کی ہر چیز مہیا کی جاتی ہے۔ کوئی غریب نہیں ہے۔ کوئی کسی کا محتاج نہیں ہے۔ سب خوش و خرم زندگی بسر کرتے رہیں۔ بولو اہاری سلطنت میں رہنا چاہتے ہو؟“

حاکم نے بڑے اب اسے سر جھکا کر کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ ملکہ نے کہا۔ ”تم یہیں ہمارے محل میں رہو لیکن ایک بات یاد رکھنا۔“ یہ کہہ کر ایک بندہ دروازے کی طرف اشارہ کیا اور پھر بولی: ”کیونکہ دروازہ مت کھولنا۔ ورنہ ساری عمر جہنم میں رہو۔“

حاکم کو عورتوں کی اس سلطنت میں رہتے ایک برس ہو گیا تھا اس عرصے میں اس نے وزیرِ زادی کی لڑکی سے شادی کر لی تھی اور

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

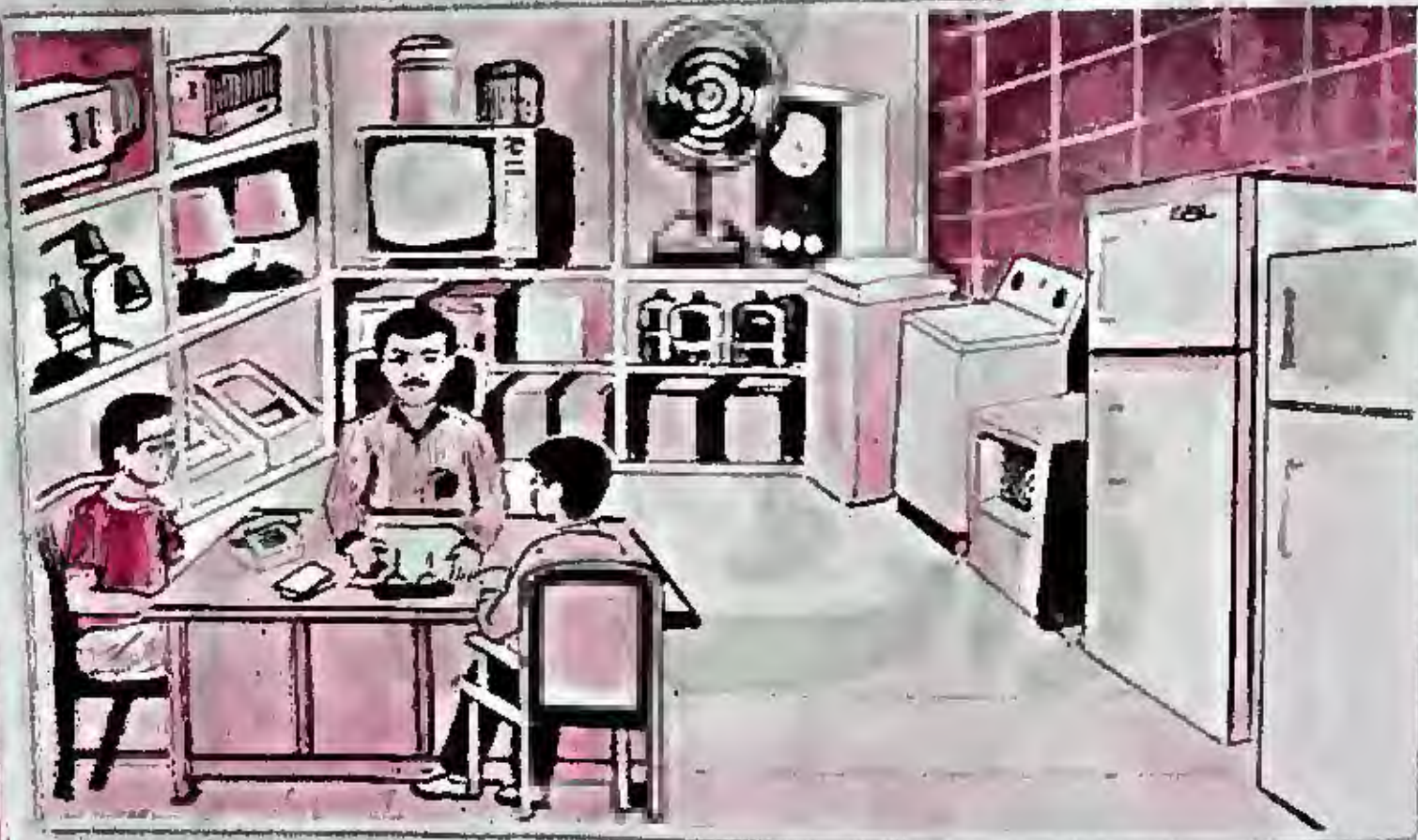


فرقان ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا لوجوان تھا۔ حساب کتاب میں بھی بہت تیز تھا۔ اس کے چچا جان لاہور کے ایک معروف بازار میں کاروبار کرتے تھے۔ فرقان اکثر اوقات لاہور آیا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ ملازمت کی تلاش میں تھا۔ اس بار وہ لاہور آیا تو اپنے چچا جان کے شوروم میں بھی گیا۔ چچا جان اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ فرقان سلام دعا کے بعد ایک طرف بیٹھ گیا۔ چچا جان شوروم میں اکاونٹ کے لیے انٹرویو کر رہے تھے۔ چچا جان نے ایک امیدوار سے سوال کیا:

اگر 3 سیڑیوں 3 چوڑے 7 منٹ میں بچ سکتے ہیں تو 6 سیڑیوں 70 منٹ میں کتنے چوڑے بچیں گے؟

امیدوار سوچ میں پڑ گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن فرقان نے چند سیکنڈ سوچنے کے بعد جھٹ سے جواب دے دیا۔

پیارے بچو! فرقان نے کیا جواب دیا؟ آپ بھی تھوڑا سا سوچئے اور جواب لکھ کر بھیجئے۔



جون 2014ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے" کا صحیح جواب یہ ہے:

ایک شخص نے برف کے ٹکڑے پر دھماکہ رکھا اور انہی سے دھماکہ لگایا۔ انہی کے دھماکے سے برف کے ٹکڑے پر جگہ بنائی اور دھماکہ برف سے چپک

گیا۔ یہاں تک کہ برف کے ٹکڑے سے دھماکہ ہاتھ سے بغیر ٹکڑے کو ہیر نکال لیا۔

جون 2014ء کے کھوج لگائیے میں قرآن الہامی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

- 1- عبداللہ طاہر، گوتم ناولہ
- 2- ارمہ امین، فیصل آباد
- 3- سید محمد علی حسن، لاہور
- 4- فتح محمد شارق، خوشاب
- 5- محمد علیان، سرگودھا



میں شکستہ ہو گیا: دلوں وقت تیرے ہاتھ سے
میرا ساتھ چھوڑ دے یا کھل کر میرا ساتھ دے
(محمد ظلالہ سعید، فیصل آباد)

درد لکھتی: دلوں پیہم سلام لکھتی: دلوں
ہر ایک نبی کا رسول و امام لکھتی: دلوں
کسی کو بھی کسی قیمت پر بھی نہ دلوں گی کبھی
جس قلم سے میں محمد ﷺ کا نام لکھتی: دلوں
(عجیب شایین، بہاول پور)

یہ اختیار آنکھوں کا ہے یہ فیصلہ ہے دل کے پاس
سعدی و حافظ بھی کسی مسند نشینان کے پاس
کیا خطر اور کیا راہبر حیران ہیں اس بات پر
کیوں خوش نشیں ہے قافلہ اک رائدہ منزل کے پاس
(ام ظہوم، ملتان)

مزاج ہم سے زیادہ جدا نہ تھا اس کا
جب اپنے طور پر تھے تو کیا گدہ اس کا
وہ اپنے زعم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
اسے گماں بھی نہیں میں نہیں رہا اس کا
(جاوید رحمان، سیال کوٹ)

اے دل نہ بنا غیر کو محرم اپنا
ہر زخم پہ آپ رکھ تو مرہم اپنا
تجائی میں آپ اپنے دکھ درد کو جھیل
اپنے کو بنا آپ ہی بندھم اپنا
(عمران تنویر، گجرات)

آج تجائی کسی بندھم ویریں کی طرح
کرتے آئی ہے مری سائی گری شام و خط
خفقہ بیٹھے ہیں ہم دلوں کے حساب ابھرے
اور تراکس جھلکے کے ہر سانسے سے
(سائر، تری، سیال کوٹ)

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مے ہمیوں کے نشان کیسے کیسے
(مریم صدیقہ راجپوت، گوجرانوالہ)

سب فنا ہو جائیں گے کائی و لیکن حشر تک
نعت حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا
(محمد اسد عبداللہ قادری، کاسوگی)

پلتا رہا جو آبلہ پائی کے باوجود
منزل کا مستحق وہی صحرا نورد ہے
(شیرہ جاوید، گوجرانوالہ)

زاہد طواف یار سے مجھ کو کہاں ہے فرصت
کہنے کو جاتے ہیں دی جن کا حرم نہیں
(محمد عمر عطا قادری، کاسوگی)

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب مٹا و جمادات و نباتات
(منیر مشتاق، گجرات)

یہ پیام دے گئی مجھے بادِ صبح مہادی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشای
(محمد الرحمن، راول پنڈی)

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک میرا
آسمان چیر گیا تالہ بے باک میرا
(سید شہریار، لاہور)

ایسا کوئی نہیں جو کہے میں ہوں خود خراب
ہر شخص کہہ رہا ہے زمانہ خراب ہے
(حراسید شاہ، جوہر آباد)

کو سوئے ہوئے تھے۔ اپنی کمپنی کے تمام ڈیزائنرز کے ساتھ ارسلان کا رویہ بہت دوستانہ تھا مگر انہیں غریبوں سے سخت نفرت تھی۔ کمپنی کے تمام لوگ ارسلان کی بہت عزت کرتے تھے لیکن ان کی یہ خصلت اور برائی تمام خوبیوں پر حاوی ہو جاتی۔ معروف کمپنی ہونے کی وجہ سے ان کے در پر کوئی نہ کوئی سوالی آس لگائے بیٹھا ہوتا۔ ارسلان کی کمپنی خوب ترقی کر رہی تھی۔ کمپنی کے سب لوگ جب ارسلان کا غریبوں سے ہنک آمیز رویہ دیکھتے تو انہیں بے حد افسوس ہوتا۔ وہ نوکری سے نکالے جانے اور ارسلان کی ناراضگی کے ڈر سے چپ رہنے میں اپنی ممانعت جانتے۔ خالد صاحب بھی ان کے ساتھ بات کرنے سے کتراتے تھے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ ارسلان سے ایسی بات کہہ سکے۔

کچھ عرصہ بعد ان کی کمپنی میں ایک نیا لڑکا کامران آیا۔ وہ نہایت محنتی اور ذہین تھا۔ اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ان کے افسر بالا غریب افراد سے کھپے رہتے ہیں۔

ایک روز ایک بوڑھے فقیر نے ارسلان سے کچھ مانگا تو وہ آگ بگولہ ہو گئے اور ان کو برا بھلا کہہ کر آفس سے باہر نکلوا دیا۔ کامران کو بہت دکھ ہوا اس نے اس سلسلے میں ارسلان سے بات کرنے کا سوچا اور مناسب موقع پر ان نے ارسلان کو است کہتے ہوئے سمجھایا اور کہا: "جناب آپ ہم پر جو اضافی اخراجات کرتے ہیں، براہ مہربانی آپ یہ رقم ملازموں میں تقسیم کر دیا کریں۔ اس سے ان کے مالی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ہم ان بے آسراؤں کو یوں لاچار اور ذلیل ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔" کمپنی کے تمام ملازمین نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ارسلان کو احساس ہو گیا تھا۔ اگلے ہل میں ان نے ایک ارادہ کر لیا اور اپنے ارد گرد رہنے والے غریب گھرانوں کو انہوں نے خوب صورت کپڑے تحفہ پیش کیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے وہ رقم بھی دے دی جو آج کل کے لیے مخصوص تھی۔ وہ سب لوگ حیران بھی تھے اور ممنون بھی کہ ارسلان میں اتنی بڑی تبدیلی آچانک کیسے آگئی۔ اس کا جواب تو صرف ارسلان کو پتا تھا جس نے جان لیا تھا کہ دلی سکون تو صرف خلق خدا کی خدمت میں ہے۔ سناٹے دکھ سکھ اور دوسروں کو خوشیاں دینے والے کسی تباہ نہیں ہوتے۔ ارسلان کو اس عید پر حقیقی خوشی ہوئی تھی۔

(پہلا شمارہ: 1995ء کے لیے)



(شاہ بہرام انصاری، ملتان)

"لو بھئی! رمضان المبارک کے روزے پورے ہوئے اور عید کی خوشی میں آپ کے لیے زبردست خوش خبری! اس ماہ آپ سب کو ذیل تنخواہ دی جائے گی۔" بزنس مین ارسلان مینگ ختم ہونے کے بعد کرسی سے اٹھتے ہوئے اعلان کر رہے تھے۔ "شکریہ سرا" بیک وقت کئی آوازیں سننے کو ملیں۔ "اچھا خالد صاحب! اب میں چلتا ہوں، میری ایک ضروری مینگ ہے۔" ارسلان سراج یہ کہہ کر بجلی کی سی تیزی سے لفٹ میں سوار ہو گئے۔ خالد ان سے ضروری بات کرنا چاہ رہے تھے لیکن ان کے پاس اتنا وقت کہاں تھا۔ اپنے سناٹ کو ایسی خوش خبریاں وہ اکثر دہیشت سناتے رہتے تھے اور ان کے کانوں کو بھی ہر مہینے کسی نہ کسی بزنس آفر سننے کی عادت ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود ایک بات ان سب کو اداس کیے رکھتی۔ عید الفطر قریب آئی تو بازار سحری تک کھلے رہتے۔ لوگ حق اور جوق خریداری کر رہے تھے۔ دکان داروں کی "اسٹاکل عید ڈسکاؤنٹ لسٹ" میں مختلف چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ غریب لوگ اشیاء کی قیمتیں جان کر اپنے پاؤں لوٹ آتے۔ ارسلان کی کمپنی دیدہ زیب کارمنشیں کے جوائے سے ملکتی گیر شہرت رکھتی تھی۔ ارسلان ایک غیر ذمہ دار شخص تھے۔ وہ اپنی کمپنی کے برائے نام مالک تھے ورنہ سارے معاملات اور لین دین ان کے منجر خالد کرتے تھے۔ خالد صاحب ایک منجھے ہوئے اور تجربہ کار شخص تھے۔ ارسلان کو ان پر مکمل بھروسہ تھا، ان لیے تمام اہم کام ان

فلاح

(مریم صاحبہ، پند و انداز)

دوبارہ کے رات رہے تھے مگر عروج اب تک اسکول سے نہ
 لوٹی تھی۔ اس کی بڑی بہن سنبل کو فکر لاحق ہو رہی تھی۔ امی ابا
 شادی کی دعوت میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ نلہر کی نماز پڑھ
 کر سنبل نے عروج کے پہ خیریت اونے کی دعا کی۔ ابھی وہ دعا
 سے قدرتی تھی، ہوئی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے جا کر
 دوبارہ دیکھا تو سامنے عروج پریشان چہرہ لیے کھڑی تھی۔ "کیا ہوا
 عروج؟ تم اتنا لیت کیوں آئیں؟" سنبل نے پوچھا جس پر عروج
 جواب دینے کی بجائے سیدھا اندر گھس آئی اور کچن میں جا کر فرج
 سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور غلاغت ایک ہی سانس میں
 پینے لگی۔

"اب بتا بھی دو، کیا ہوا ہے؟" سنبل وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔
 عروج پانی پی کر فارغ ہوئی تو کندھے سے لگا اپنا بیگ اتارا اور
 اس میں سے ایک کاپی نکال کر سنبل کے سامنے رکھ دی جس پر
 نہایت خوب صورت کورچہ تھا۔ سنبل نے حیرت زدہ ہو کر
 کاپی الٹائی اور اسے البت پلٹ کر دیکھا۔ کاپی کے دائیں صفحے پر
 "ماہینہ ماہینہ" ماہینہ ماہینہ لکھا ہوا تھا۔ سنبل نے سوالیہ نظروں سے
 عروج کی طرف دیکھا جس پر عروج گویا ہوئی۔

"ماہینہ میری کا اس فیلو ہے۔ کچھ دن پہلے اس نے میرے
 بیگ سے پیسے تہا لیے تھے۔ میری دوستوں کو بھی میرے خلاف
 بھڑکاتی رہتی ہے اور کل تو اس نے حد کر دی اور کہا کہ میں اسے
 خواہ مخواہ تنگ کرتی ہوں۔ یعنی الٹا چور کو توال کو ڈانٹنے۔"

"تم پڑھائی میں اس سے بہتر ہو۔ شاید اسی جگہ کے تحت وہ
 تم سے ایسا سلوک کرتی ہو۔" سنبل نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "وجہ جو
 بھی ہو، میں نے بھی اسے ایسا سبق سکھایا ہے کہ ہمیشہ یاد رکھے
 گی۔ تہذیبی ریاضی کی استانی صلابت بہت سخت ہیں۔ پڑھائی میں
 کوئی ہلکا سا برداشت نہیں کرتی اور ہوم ورک نہ کرنے پر تو جان
 ہی نکال لیتی ہیں۔ میں ماہینہ کے بیگ سے ریاضی کی کاپی نکال کر
 لے آئی ہوں۔ دیکھنا، کل اس کے ساتھ کیا ہو گا؟" عروج چہرے
 پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

"یہ غلط طریقہ ہے عروج! جنہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

ماہینہ اس طرح کی حرکتیں کر کے تمہارا دھیان پڑھائی سے ہٹا
 چاہتی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے، وہ کامیاب ہو رہی ہے
 کیوں کہ تم اپنی پڑھائی پر توجہ دینے کی بجائے اسے سبق سکھانے
 کی فکر میں لگی ہوئی ہو۔ نرائی کا جواب نرائی سے نہیں دینا چاہیے۔
 جانتی ہو؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے: "اگر تم اپنے دشمن
 سے بہترین انتقام لینا چاہتے ہو تو اپنی خوبیوں میں اضافہ کر لو۔"
 سنبل نہایت رسائی سے عروج کو سمجھائے جا رہی تھی۔ کچھ
 ہی دیر بعد عروج ریاضی کی کاپی ہاتھ میں تھامے، محلے کے کسی بچے
 کو ماہینہ کا گھر سمجھا رہی تھی۔ وہ ماہینہ کی کاپی اسے واپس بھجوا رہی
 تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ نرائی کا بدلہ نرائی سے نہیں، بلکہ اچھائی
 سے دیا جاتا ہے۔

سالانہ امتحانات نہایت قریب آچکے تھے۔ ماہینہ ابھی بھی عروج
 کو تنگ کرنے کے لیے طرح طرح کی حرکتیں کرتی رہتی مگر عروج
 نے پہلے سے زیادہ ڈٹ کر پڑھائی شروع کر دی۔ اس نے اپنے
 آپ کو بہتر سے بہتر بنانا تھا۔

ماہینہ بہت خوش تھی کہ سارا سال عروج کو تنگ کر کے، اس کا دھیان
 پڑھائی سے ہٹانے میں کامیاب رہی ہے۔

عروج پوری کا اس میں اول نمبر پر آئی تھی جب کہ دوسری
 طرف ماہینہ نئی طرح سے فیل ہوئی تھی۔ عروج کو نیچا دکھانے اور
 اسے تنگ کرنے کی کوششوں میں لگے رہنے کی بدولت، اس کا
 دھیان پڑھائی سے ہٹ چکا تھا اس لیے آج وہ ایک کونے میں
 کھڑی رو رہی تھی۔

"تمہارا شکر یہ سنبل! تم نے میری صحیح راہنمائی کی۔" عروج،
 سنبل کے گلے لگ گئی۔

"بے شک، دین کی باتوں میں فلاح ہے۔" سنبل نے تفکرانہ
 انداز میں آسمان کی طرف دیکھا اور عروج کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی
 جانب چل پڑی جہاں ان کے والدین ان کے منتظر تھے۔

(دوسرا انعام: 125 روپے کی کتاب)

ظلال کی گلابی

(تحریک حیات، گوجرانولہ)

آج پھر عاشر صاحب کی بیوی اپنے میاں کو کوس رہی تھیں کہ
 ان کے پاس نہ تو گاڑی ہے اور نہ بنگلہ اور نہ ہی ان کے بچے

ادھر اظہر صاحب کے گھر پر چوری ہو گئی۔ ان کی رشوت خوری کی خبر پولیس تک جا پہنچی اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ ہمیں ہمیشہ حرام سے دور رہنا چاہیے اور حلال کی روزی کمانی چاہیے۔ چاہے وہ کیم ہی کیوں نہ ہو۔

(تیسرا اقام 115 روپے کی کتب)

مال کی ناقص مالیت

(مکمل حقیق، ایک)

فرہاد کمرہ امتحان میں بیٹھا۔ دل میں اللہ کا ذکر کر رہا تھا۔ تمام طلباء کے چہروں پر بے چینی تھی۔ سب کو ایک ہی دھڑکا تھا کہ نہ جانے پتھر کیسا ہوگا، لیکن فرہاد پر اعتماد تھا۔ کیوں کہ اس نے محنت کی تھی۔ پتھر شروع ہو گیا تھا۔ سوالیہ پرچہ دیکھ کر فرہاد کی خوشی کا ٹھکانا ہی نہ رہا کیوں کہ اس کو تمام سوالات بہت اچھی طرح سے آتے تھے۔ لیکن یہ کیا؟ جو پتھر اس نے لکھا شروع کیا تو تمام سوالات بھول گیا۔ وہ اس اچانت بری صورت حال سے بہت گھبرایا۔ اس نے ذہن پر بہت زور دیا لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ اس نے ہال میں نظر دوڑائی تو دیکھا کہ تمام طلباء سر جھکائے پتھر کرنے میں مصروف تھے۔ صرف ایک وہ ہی تھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"یاما مالک! آخر میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے تو پوری تیاری کی تھی۔ میرے مالک مجھ پر رحم فرما۔" بے بسی سے سوچتے ہوئے وہ روئے کے قریب ہو گیا۔

"تم نے تو بہت اچھی تیاری کی تھی۔ کچھ یاد ہے رات کو کیا کیا تھا۔ تم تو سکون سے سو گئے تھے لیکن تمہاری وجہ سے تمہاری ماں رات بھر روتی رہی۔ اور یاد ہے کہ صبح کیا حرکت کر کے آئے ہو؟" یہ اس کے ضمیر کی آواز تھی جس نے اس کو رات والی ساری بات یاد دلادی تھی۔ واقعی وہ تو سب کچھ بھول گیا اور اسے یاد آیا کہ رات کو ماں نے سر میں درد کی وجہ سے اس سے پانی مانگا تو اس نے کس قدر غصے سے جواب دیا تھا۔ "کیا مصیبت ہے ایک تو آرام سے پڑنے بھی نہیں دیتی ہیں آپ۔" اور پھر ماں نے خود ہی پانی پی لیا تھا۔ پھر رات کو کھانے میں ملے ہوئے دیکھ کر وہ غصے سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ ماں نے لاکھ مٹیں بھی کیں کہ کوئی اور چیز بنا دیتی ہوں لیکن اس کی ایک ہی جہد تھی کہ "جب آپ کو

بڑے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ شام کو پھر دونوں میاں بیوی میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ ان کی بیوی پھر انہیں ان کے دوست اظہر کی مثال دینے لگیں۔ "دیکھیں ان کے پاس کتنا بڑا بنگلہ ہے اور کتنی گاڑیاں اور ایک ام ہیں ہر وقت رکشوں پر دھکے کھاتے ہیں۔ ذرا انک روم کی چھت پھر سے پکٹنے لگ گئی ہے۔"

"تغذو! ملے گی تو ٹھیک کروالیں گے۔" عاشر صاحب نے جان چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

اظہر عاشر کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ ان دونوں میں کافی دوستی ہو گئی تھی۔ یوں تو وہ دونوں ایک ہی پوسٹ پر تھے لیکن اظہر صاحب کے پاس ناجائز ذرائع سے حاصل کیا گیا بہت سا روپیہ تھا۔ ان کا پیسہ دیکھ کر عاشر صاحب کی بیوی بھی انہیں ناجائز کام کرنے کو کہتی لیکن وہ اپنا ضمیر بچنے کو تیار نہ ہوتے اور اپنی بیوی کو بہت سمجھاتے کہ حرام کی کمائی سے آسائش تو مل جاتی ہیں لیکن دل کا سکون کبھی نصیب نہیں ہوتا اور حرام کا پیسہ زیادہ دیر تک نہیں رہ پاتا۔ ایک نہ ایک دن اللہ کی پکڑ ضرور ہوتی ہے لیکن ان کی بیگم صاحبہ کے کان پر جوں تک نہ رہتی۔

آج عاشر صاحب کی بیوی اپنی بیٹی کے ساتھ بازار جانے کے لیے باہر نکلیں تو بہت دیر انتظار کے بعد انہیں ایک رکشہ ملا۔ رکشے والے نے بازار تک جانے کے لیے دو سواریوں کا کرایہ بیس روپے مانگا۔ کچھ ہی دیر میں باقی چار سیٹوں پر بھی دو عورتیں اور دو مرد بیٹھ گئے اور رکشہ بازار کی طرف چل پڑا۔ عاشر صاحب کی بیوی نے کرائے کے لیے بیس روپے نکالے تو حیران ہوا سے ان کے پیسے ان کے ہاتھ سے نکل کر اڑ گئے۔ دس روپے کا ایک نوٹ پیچھے بیٹھی بیٹی نے پکڑ لیا اور انہیں دے دیا اور باقی نوٹ کا نوٹ پھراتے ہوئے کہا۔ "آئی ایس آپ بیکے دس روپے سڑک پر گر گئے تھے۔"

عاشر صاحب کی بیوی حیرانی سے پیسے دیکھنے لگیں۔ پیچھے سے اترنے والی عورت نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔

"ہمیں اللہ سے آپ کے شوہر بہت ایمان داری سے کہاتے

ہیں اور حلال ہی کہاتے ہوں گے۔ اسی لیے تو اللہ نے آپ کو آپ

کے پیسے لوٹا دیے۔"

"ہاں! میرے بیان ہمیشہ سچا نکالتے ہیں۔ یہ الفاظ کہتے

ہوئے انہیں خود پر اور اپنے میاں پر فخر محسوس ہونے لگا۔

اپنے پاس رکھ لیے اور چھوٹے بھائی کو بھر اور پتھر لیے جسے وہ دے دیے۔ بیل اپنے پاس رکھ لیا اور کتا چھوٹے بھائی کو دے دیا۔ چھوٹا بھائی بے حد رنجیدہ ہوا۔ اسے یہ پریشانی بھی تھی کہ بیل کے بغیر وہ پتھریلی اور بھر زمین کیسے کاشت کرے گا لیکن اس نے ہمت سے کام لیا اور دوسرے دن صبح سویرے اپنے کتے کے ساتھ زمین پر پہنچ گیا۔ اس نے بے سروسامانی کے باوجود محنت سے کام لیا۔ سب سے پہلے اس نے زمین سے پتھر ہٹائے اور کدال سے زمین کو ہوائی کے لیے تیار کیا۔ زمین ٹھیک کرنے کے بعد اسے لگر ہوئی کہ بیج کیسے حاصل کیا جائے؟ اسی لگر میں وہ کھیتوں سے نکل کر جانے لگا۔ راستے میں اسے ڈی پرندہ نظر آیا جس کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہوا تھا۔ حامد نے فوراً اس کے پاؤں سے کانٹا نکالا۔ رزم صاف کیا اور پرندے کو چھوڑ دیا۔ پرندہ اڑ کر درخت پر بیٹھ گیا۔ حامد جیسے ہی آکے بڑھا اسے آواز سنائی دی۔ "حامد! حامد!....." اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا تو کسی کو نہ پایا اور درخت پر بیٹھے پرندے سے پوچھا۔ "کیا تم نے مجھے آواز دی ہے؟" پرندے نے کہا۔ "ہاں میں نے آواز دی ہے۔" حامد میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت محنت کر رہے ہو اور آج میں تمہیں تمہاری محنت اور ہمدردی کا انعام دینا چاہتا ہوں۔"

حامد نے پوچھا۔ "انعام؟" پرندے نے کہا۔ "تم اس درخت کے پیچھے پرندے تربوز کو اٹھا لو۔ اس کے بیج تم اپنے کھیتوں میں بو دو۔" حامد کو پرندے کی بات پر حیرت ہوئی۔ وہ پرندے کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پرندے کا شکریہ ادا کیا اور تربوز کو اٹھا لیا۔ اگلی صبح اس نے تربوز کے بیج کھیت میں ڈال دیے۔ شام کو کھیت میں پانی دے کر وہ گھر چلا آیا۔ ہر روز حامد اپنے کھیت میں جا کر بیج لگاتا اور شام کو پانی دے کر واپس گھر آ جاتا۔ رفتہ رفتہ اس کا کھیت تربوز کی بیلوں سے بھر گیا۔ اس نے تربوزوں کو اپنے داموں بازار میں فروخت کیا اور خوب رقم کمائی۔ محنت نے حامد کے دن بھر دیے۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔ دوسری طرف خالد اپنی کالی اور سستی کی وجہ سے ہرے بھرے کھیتوں کو بھی اجازت بیٹھا بیٹھا جگے کالی اور سست انسان اپنی کالی اور سستی سے سونے کے پہاڑ کے باوجود آخر کار خالی ہاتھ رہ جاتا ہے اور محنت کرنے والا ملتی میں بھی سونا اکا سکتا ہے۔

(انعام: 115 روپے کی کتب)

پتا بھی ہے کہ یہ سبزی مجھے پسند نہیں ہے تو پھر روزانہ کیوں بنا دیتی ہیں۔" ماں کو اس کی باتوں سے بہت دکھ اور درد لگی دل کے ساتھ بغیر کھائے رات بھر روتی رہی۔ رونے کی وجہ سے ماں کو بخار ہو گیا لیکن اس کے باوجود انہوں نے فرہاد کے لیے ناشتا تیار کیا۔ فرہاد نے ان کا حال تک نہ پوچھا اور ناشتا کرتا رہا۔ دل نے کہا کہ ماں سے دعا تو لیتے جاؤ لیکن اس نے سوچا کہ "دعا سے کیسے کامیابی ملے گی جب کہ محنت تو میری اپنی ہی ہوگی، جتنی محنت کروں گا اتنی ہی پہچا اچھا ہوگا۔" اب اس کو ماں کی نافرمانی کی سزا مل چکی تھی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ ماں کی دعا سے ہی کامیابی مل سکتی ہے کیوں کہ ماں راضی ہوگی تو خدا بھی راضی ہوگا۔ اس نے بروگڑا کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ "میں آج کے بعد کبھی بھی ماں کا دل نہیں دکھاؤں گا۔" گھر آ کر اس نے ماں سے معافی مانگی۔ ماں نے معاف کر دیا اور فرہاد نے شکرانے کے نوافل ادا کیے اور اس کے بعد کبھی بھی ماں کا دل نہ دکھایا اور آج وہ ایک بہت بڑا ڈاکٹر ہے اور یہی کہتا ہے کہ "میری کامیابی کا راز میری ماں کی دعائیں ہیں۔" ساتھیوں ماں کی نافرمانی سے ہمیشہ بچتا۔ کیوں کہ جو ماں کی نافرمانی کرتا ہے اس کو دنیا و آخرت میں سکون نہیں ملتا۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

انعام

(سیرت: ذریعہ اسماعیل خان)

بہت سال پہلے کی بات ہے کسی گاؤں میں خالد اور حامد دو بھائی رہتے تھے۔ حامد بہت محنتی تھا جب کہ خالد بہت کالیں اور سست تھا۔ دونوں کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ ان دونوں کی زمینیں بھی تھیں۔ وہ اپنی زمین کو محنت و مشقت سے کاشت کرتے تھے۔ خالد حامد کی عزت کرتا تھا۔ اسی لیے دونوں خوش رہ رہے تھے۔ حامد زمین میں اچھے بیج لگایا کرتا جب کہ خالد ہر وقت سویا رہتا۔ ایک دن اچانک بڑے بھائی خالد کو خیال آیا کہ دونوں کو زمین تقسیم کر لینی چاہیے۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی حامد سے مشورہ کیا۔ چھوٹے بھائی نے سوچا کہ بڑے بھائی کو کام کرنے کی عادت تو نہیں ہے۔ آخر وہ الگ زمین کا کیا کرے گا۔ مجبوراً اس نے بھی ہاں کر دی۔ بڑے بھائی نے زمین کے سارے زرخیز حصے

ہار بھی میگزین بہت اچھا تھا۔ تمام چیزیں اچھی تھیں۔ تمام قارئین کے لیے دعا گو ہوں۔
(رہنما کون، پبک جسر)

ہمیشہ کی طرح سرورق پسند آیا۔ کہانیاں بہت پسند آئیں۔ نور محل کے بارے میں پڑھ کر اس کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ نظم جاگو جاگو ہوا سویرا اچھی تھی۔ ذائقہ کارز میں تکہ بوٹی کی ترکیب پڑھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ سچ کی خوش بو اور حضرت ابو بکر کا پڑھ کر ان کے عہد کے متعلق پتا چلا۔
(مدینہ خائف، لاہور)

☆ آپ سب نے بہت خوب صورت اور رنگین خط لکھے ہیں۔ آپ کی محبت اور شوق کا بہت شکریہ۔

السلام علیکم! میں نے پہلی مرتبہ خط لکھا ہے۔ مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے دیکھ کر میری دوست ملائکہ، تحریم اور مہرین نے بھی یہ رسالہ پڑھنا شروع کر دیا ہے کیوں کہ اس میں بہت معلومات ہوتی ہیں۔ مکی کا شمار بہت اچھا تھا۔

(عدن سجاد، ملائکہ دانی، حسنین علی، جنگ صدر)

اس ہار بھی رسالہ ٹاپ پر رہا۔ میں اپنی کہانیاں کو نہ پا کر بہت اداس ہوئی۔ کیا وہ شائع ہوں گی؟ تجسس کی معذرت۔ جاگو جاگو ہوا سویرا، انجام اور نور محل بہت پسند آئے۔ (سیونہ، ذرہ و اسماعیل خان)

تعلیم و تربیت مجھے بہت پسند ہے کیوں کہ اس میں انعامات کی برسات ہوتی ہے۔ ہر شمارہ پڑھتا ہوں۔ آج پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ کہانیوں میں راز، استارتی، دوسرا فرض اور پتھر کا قلعہ بہت پسند آئیں۔ سلسلہ مختصر مختصر بہت پسند آئے۔ (محمد شہیار، شاہ کوٹ) میں نے آپ کو ایک حکایت بھیجی تھی۔ آپ نے نہ حکایت شائع کی اور نہ ہی جواب دیا۔ میں نے آپ کو ایک کہانی بھیجی ہے۔ ضرور جگہ دیں بشرطیکہ معیاری ہو۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔
(محمد نعیم امین، لاہور)

☆ ذمیر فیم! آپ بہت اچھے بچے ہیں۔ آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ میری کہانی معیاری ہو تو ضرور شائع کریں۔ آپ کے لیے ڈیروں دعا کریں۔

میں ملتم جماعت کی طالبہ ہوں۔ میری چھوٹی بہن اور کزن بہت شوق سے تعلیم و تربیت پڑھتے ہیں۔ ہماری ماما اور خالہ بچپن سے پڑھ رہی ہیں۔ پیارے اللہ کے پیارے نام ہمیں بہت پسند ہے۔
(اربابہ مدہم، ماہینہ مدہم، شیرازہ محمد)

یہ میرا پہلا خط ہے۔



عزیز تعلیم و تربیت السلام علیکم! میں آپ کے

آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ نے میرا خط گزشتہ ماہ شائع کیا۔ امتحانات کے بعد میں نے تعلیم و تربیت کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ درس قرآن و حدیث نے ہمیشہ کی طرح ہمارے عقل و شعور کو روشنی کی بہت موز دیا۔ پیارے اللہ کے پیارے نام نہ صرف میرا بلکہ میری اماں جان کا بھی پسندیدہ سلسلہ ہے۔ سنہری جزیرہ، ناول دولت پور میں انتہائی دل چسپ تھے۔ شیخ سلطان اور جہانگیر خان پڑھ کر اپنے اسلاف پر فخر محسوس ہوا۔ محمد علی سکے پر بھی مضمون شائع کریں۔

(منائل افضل، لاہور)

☆ منائل افضل! پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ ہماری ہا قاعدہ اور ہولناک قاری ہیں۔ آپ کی اور آپ کی والدہ صاحبہ کی آراء کا انتظار رہے گا۔ والدہ صاحبہ کو سلام دیجیے گا۔

اس ہار کا رسالہ بہت زبردست تھا۔ ہم اپنی تصویریں ڈھونڈتے رہے، وہ آپ نے لگائی نہیں۔ پچھلی ہار کتابوں کا انعام جیتا جو ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ اپنا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔

(عبداللہ طاہر، منی طاہر، گوجرانوالہ)

آپ کا کیا حال ہے؟ پہلے کی نسبت تعلیم و تربیت میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ سلسلہ "میری بیاض سے" بہت پسند آیا۔ رمضان المبارک کی پیشگی مبارک باد قبول کریں۔ رمضان میں بہت مزا آتا ہے۔ میں سارے روزے رکھتی ہوں۔ اس ہار بھی رکھوں گی۔

(الراح اکبر، لاہور)

میں تعلیم و تربیت کی نئی قاری ہوں۔ پہلی ہار خط لکھ رہی ہوں۔ اس

سب باری باری پڑھتے ہیں۔ میں ایک طالب علم ہوں، مجھے کتابوں سے بہت پیار ہے۔ جون کا شمار بہت زبردست تھا۔ استاد جی اور پتھر کا قلعہ اچھی کہانیاں تھیں۔ گرمیوں کی چھنیاں ہو رہی ہیں۔ بہت گرمی ہے۔

(سینہ خان، دربار)

تعلیم و تربیت بہت اچھا اور انتہائی دل کش میگزین ہے۔ اس کے سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ میں اس کا پرانا قاری ہوں۔ بلا عنوان کے تحت وہ عنوانات جو انعام کے حق دار نہیں ہوتے، ان کے عنوانات بھی شائع کر دیا کریں۔ (شاہ زیب احمد، چیمپو)

☆ آپ کی تجویز پر عمل کریں گے۔ خط لکھنے کا شکریہ! میں سات سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں اور خط پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ ایک نظم بھیج رہا ہوں، پلیز ضرور شائع کیجئے گا۔ میری لکھائی کیسی ہے؟ میرا خط ردی کی ٹوکری سے بچائیے گا۔

(عابد ہلال ضدیق، منڈی بہاؤ)

میں نے کچھ مضامین بھیجے تھے مگر آپ نے اپریل، مئی میں نہیں لگائے۔ تاہم ایک مرتبہ پھر ارسال کر رہا ہوں۔

(مہدالوحید حراج، سماں وال)

☆ جناب عبدالوحید صاحب! آپ اپنا رابطہ نمبر ارسال کریں یا خود رابطہ کریں۔

پچھلے ماہ بورڈ کے امتحانات کی وجہ سے حاضری نہ دے سکی۔ جون کے شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ ناول "دولت پور میں" زبردست جا رہا ہے۔ باقی سلسلے بھی اچھے ہیں۔ "میری بیاض سے" زبردست سلسلہ ہے۔

(مریم صدیقہ راجپوت، گوجرانوالہ)

اس کے علاوہ جن بچوں کے خطوط ہمیں موصول ہوئے ان کے نام یہ ہیں: ہمایوں رشید، اسلام آباد۔ مہرین آمین، جھنگ صدر۔ حافظ محمد ذکوان شفیق، چشمہ۔ ثروت یعقوب، مصباح صابر، آمنہ ظفر، ساگرہ رحمن، عابد رحمن، خالیہ ارم، محمد حمزہ مقصود، خرم اقبال، سرگودھا۔ کرن فاروق، صاحب شوکت، گوجرانوالہ کینٹ۔ حافظ عبداللہ انعام، کجرات۔ سعیدہ النساء، صفاء رشید، کراچی۔ محمد زبیر جمیل، خانوالہ۔ سعید احمد، انک۔ محمد عمیر سلیم، ساسی وال۔ صبا جاوید، انک۔ آجی آباد۔ محمد حسنین معادینہ، ڈی آئی خان۔ محمد احمد، چیمپو۔ قاری محمد ندیم عطاری، اوکاڑہ۔ عبداللہ ایوب، جہلم۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔

☆☆

جون کا شمار بہت خوب صورت اور دل کش تھا۔ سب کہانیاں زبردست تھیں۔ اٹلانک نے پورے شمارے کا مزا دہلا کر دیا۔ شاعری کا سلسلہ بھی اچھا ہے۔ مجھے شکایت ہے کہ میں اپنی بہت سی تحریریں بھیج چکا ہوں لیکن شائع نہیں ہوئیں۔ (بہر حیات، انارک، راولپنڈی)

جون کا شمار ناپ پر تھا۔ سالانہ خریدار بننے کے لیے کیا کرنا پڑے گا۔ میں آپ کے ٹیلی فون نمبروں پر کال کرتا ہوں لیکن کوئی رابطہ نہیں ہو پاتا۔

☆ سالانہ خریدار بننے کے لیے 850 روپے کا منی آرڈر تعلیم و تربیت کے پتے پر روانہ کر دیں۔ آپ اپنا رابطہ نمبر ضرور لکھ کر بھیجیں۔

میں دس سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ یہ میرا پہلا خط ہے، امید ہے ضرور شائع ہو گا۔ اس کے علاوہ کچھ تحریریں بھی بھیجی ہیں۔ ضرور شائع کیجئے گا، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔ مئی کے شمارے میں تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ سنہری جزیرہ زیادہ پسند آئی۔

(بانکے سلام، آمنہ سلام، اسلام آباد)

میں دسمبر 2009 سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں مگر خط پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے دوستوں عبدی، کرسش اور حاجی کو اس کا مستقل قاری بنا دیا ہے۔ (ارسلان بھٹی، ڈیرہ اسماعیل خان)

یہ میرا تعلیم و تربیت میں پہلا خط ہے۔ امید ہے ضرور شائع ہو گا۔ سلسلہ آپ بھی لکھنے بہت اچھا ہے۔ اس سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ میں نے بھی ایک کہانی لکھی ہے جو اگلی بار ارسال کروں گا۔ بلا عنوان میں کراچی والوں کا نام نہیں ہوتا۔ جون کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔

(عریضہ آفت، سیف محمد احمد، کراچی)

☆ تعریف کا شکریہ کہانی ضرور ارسال کریں۔ بلا عنوان میں کراچی والوں کا نام اکثر آتا رہتا ہے۔

میں تعلیم و تربیت ایک سال سے پڑھ رہی ہوں۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ میرے تمام بہن بھائیوں کو بھی پسند ہے۔ کہانیاں استاد جی، ہم بھی آخر بچے ہیں، بہت اچھی تھیں۔

(نایاب آنری، پشاور)

امید کرتی ہوں آپ ٹھیک ہوں گے۔ میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میرے تمام گھر والے اس کے دیوانے ہیں اور



"میری ماں تو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے....." اور فوراً ہی طارق نے سوچا۔ مگر فریدہ نے کیسے جعفر کی بات مان لی لیکن میں نے اس سے لڑائی کی تھی۔ وہ مجھ سے ناراض تھی۔ اسی لیے اس نے جعفر کی بات کا یقین کر لیا۔

طارق چند قدم آگے بڑھا۔ اس نے اپنے مکان کا دروازہ کھلا دیکھا۔ اسے پتا چل گیا کہ ماں گھر پر ہی ہے۔ طارق نے سوچا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ ماں نے بھی جعفر کی جھوٹی باتوں کا یقین کر لیا ہے۔ اسی لیے وہ اب میرا انتظار کر رہی ہے تاکہ میں گھر جاؤں اور وہ مجھے جاتے ہی ڈانٹنے لگے۔

طارق پھر رُک گیا۔ اس نے پھر مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا اور فوراً سوچا۔ مجھے گھر نہیں جانا چاہیے۔ مجھے ماں ڈانٹنے گی۔ مجھے کبھی ماں کی ڈانٹ نہیں پڑی۔ میں اپنی ماں کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا۔ طارق نے فیصلہ کیا۔ "میں گھر نہیں جاؤں گا۔ ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔" طارق یہ ارادہ کر کے مڑنے ہی لگا تھا کہ اس کی ماں نے دیکھ لیا اور اسے آواز دی۔ اس سے پہلے کہ طارق پھر کچھ سوچتا۔ اس کی ماں گھر سے بھاگی ہوئی آئی اور اپنے بیٹے سے کہا۔

"میرے لال! میرے بچے....." ماں کی آنکھوں سے محبت کے دریا بہہ نکلے۔ ماں کی آواز گلے میں اٹک گئی اور اس نے اپنے بیٹے کو

طارق دریا سے پیدل واپس آ رہا تھا۔ اسے راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا کیوں کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ طارق کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو گیا، کیسے ہو گیا۔

طارق رو رہا تھا اور چل رہا تھا۔ چل رہا تھا اور رو رہا تھا۔ اس سے پہلے جب سب لوگ اسے دریا کے کنارے چھوڑ کر چلے گئے تھے، وہ اکیللا رہ گیا تھا۔ اس وقت وہ کنارے پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

طارق کوٹھی کے پچانک پر رُک گیا۔ آنکھوں سے آنسو پونچھے۔ اپنی قمیص سے منہ کو اچھی طرح صاف کیا اور ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔

طارق کا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ باغ کے پاس سے گزرنے لگا تو احتیاط سے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ طارق سے سوچا کہ فریدہ اور جعفر مجھ سے بہت پہلے کوٹھی میں پہنچ چکے ہیں۔

انہوں نے فریدہ کے ابا سے میری شکایت کر دی ہوگی۔ میری ماں کو بھی پتا چل گیا ہوگا۔ جعفر نے دریا پر اتنا جھوٹ بولا تھا، یہاں آ کر تو اور بھی جھوٹ بولا ہوگا۔ طارق باغ کے پاس اپنے مکان سے کچھ

فاصلے پر رُک گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ فریدہ کے ابا اور امی نے میری ماں کو بتا دیا ہوگا۔ دوسروں کی طرح میری ماں نے بھی یہ سمجھ لیا ہوگا کہ میں نے ہی فریدہ کو دریا میں دھکا دیا ہے۔ نہیں، میری ماں نے یقین

نہیں کیا ہوگا۔ طارق نے اپنے آپ سے کہا۔

اور بھی زور سے سینے سے لگا لیا۔ طارق کی ماں اپنے بیٹے کو مکان میں لے گئی۔ طارق اب تک رو رہا تھا۔ ماں نے اسے چارپائی پر بٹھا دیا اور اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

”ماں! میں نے فریدہ کو بالکل دھکا نہیں دیا۔ جعفر مجھے دریا میں گرانے لگا تو میرا ہاتھ فریدہ کے بازو پر جا پڑا۔ پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا۔“

”میں جانتی ہوں بیٹا! مجھے سب معلوم ہے۔ تیرے ساتھ جعفر نے دشمنی کی ہے۔ وہ تمہارا دوست بنا ہی اس لیے تھا کہ.....“ ماں چپ ہو گئی۔ باہر قدموں کی آواز آرہی تھی۔ ماں نے چونک کر دیکھا، دروازے میں فریدہ کا بازو ہانک رہا تھا۔ وہ طارق کی ماں سے کہنے لگا۔ ”بیٹی! تم کام کرنے کیوں نہیں آئیں؟“

طارق کی ماں نے بابا کی بات سنی تو وہ اور بھی بے چین ہو گئیں۔ پھر بولیں۔ ”بابا ہم جا رہے ہیں۔“

”کہاں؟“ بابا حیران ہو کر بولا۔

”کہاں..... معلوم نہیں، لیکن یہاں سے میں اپنے بیٹے کو لے کر چلی جاؤں گی۔“ بابا کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ آگے آیا۔ طارق کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا اور طارق کو چپ کراتے ہوئے بولا۔

”زور نہیں بیٹے، میں جانتا ہوں تمہارا کوئی قصور نہیں۔“

”بابا میں نے فریدہ کو نہیں گرایا۔ جعفر نے مجھے دھکا دیا تھا۔“

”جعفر اور اس کا باب ہمارا دشمن ہے۔ اس نے پہلے بھی میرے بیٹے کو مارنے کی کوشش کی تھی۔“

”اچھا!“ بابا نے حیران ہو کر کہا۔ وہ کچھ سوچنے لگا، پھر بولا۔

”پھر تم لوگوں کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ میرا بیٹا پرانے شہر میں رہتا ہے۔ آپ لوگ وہاں چلے جائیں۔“

”نہیں بابا! ہم کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے۔“ طارق کی ماں نے کہا۔

”بوجھ کی کوئی بات نہیں، میرے بیٹے کے وہ بچے ہیں۔ طارق بھی ان کے ساتھ رہے گا۔ میری بہو بھی بہت اچھی ہے۔ وہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گی۔“ بابا کے مجبور کرنے پر طارق کی ماں مان گئی۔ اس نے ٹرک میں اپنے اور طارق کے کپڑے رکھے اور دونوں ماں بیٹا کوٹھنی سے نکل کر ٹرک پر آ گئے۔ ٹرک کے اس طرف درخت کے نیچے لمبا کالا آدمی بیٹھا تھا۔ یہی آدمی دریا پر کشتی چلا کر انہیں دوسرے کنارے لے گیا تھا۔ طارق اور اس کی ماں نے کالے کو نہیں دیکھا لیکن کالا انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ طارق اور اس کی ماں کوٹھی کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ کالا بہت خوش ہوا اور اپنے دل میں کہا۔

”واہ! مزا آ گیا۔ میں ابھی جا کر جعفر کے ابا کو بتاتا ہوں۔“

کالے آدمی نے جب جعفر کے ابا کو بتایا کہ طارق کی ماں اپنے بیٹے کو لے کر کوٹھی سے نکل گئی ہیں تو جعفر کے ابا بہت خوش ہوئے۔ وہ فوراً کپڑے بدل کر تیار ہو گئے اور اپنی موٹر میں بیٹھ کر فریدہ کے گھر آ گئے۔

فریدہ کے ابا جان گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی کے لیے چائے بنوائی۔ اتنے میں جعفر اور فریدہ بھی اسی کمرے میں آ گئے۔ جعفر کے ابا نے کہا۔ ”جعفر بیٹا! تم گھر کیوں نہیں آئے۔ میں صبح سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”ابا جان! ہم لوگ دریا پر چلے گئے تھے۔“ جعفر نے جواب دیا۔

”دریا پر گئے تھے؟“ جعفر کے ابا بولے۔ ”بیٹا! مجھے بتاؤ دیا ہوتا۔ میں تو صبح سے پریشان ہوں۔ اسی پریشانی کی وجہ سے یہاں بھاگا آیا ہوں۔“

”پریشانی کی تو کوئی بات نہیں۔“ فریدہ کے ابا بولے۔ ”یہ بھی تو آپ ہی کا گھر ہے۔“

”بات گھر کی نہیں بھائی جان، ان لوگوں کے دریا پر جانے کا سنا ہے تو کچھ پریشان ہو گیا ہوں۔ ہر روز اخبار میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں دریا میں ڈوب گیا۔“

”خدا نہ کرے، خدا نہ کرے۔“ فریدہ کے ابا فوراً بولے۔ وہ رک گئے۔ پھر جلدی سے کہنے لگے۔

”بھائی جان! ایک حادثہ تو آج ہوتے ہوئے رہ گیا۔“

”کیسا حادثہ؟“ جعفر کے ابا نے چائے کی پیالی ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا۔

”ابا جان! آج فریدہ ڈوبنے لگی تھی۔“

”خدا نہ کرے، خدا نہ کرے۔“ اب کے جعفر کے ابا جلدی سے بولے۔ ”اس لیے تو میں کہتا تھا کہ دریا پر جانا ٹھیک نہیں۔“

”فریدہ تو جانے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔“ فریدہ کے ابا نے کہا۔ ”طارق اسے ساتھ لے گیا تھا۔“

”اور طارق ہی نے تو فریدہ کو دھکا دیا دے کر گرایا تھا۔“ جعفر نے فوراً کہا اور اپنے ابا کی طرف دیکھا۔

”مگر اس نے دھکا کیوں دیا؟“ جعفر کے ابا نے پوچھا۔ پھر خود ہی بولے۔ ”بہت کمینہ لگا دہڑکا۔“

”ہم تو اسے اپنے بیٹے کی طرح جانتے تھے۔“ فریدہ کے ابا کہنے ہی لگے تھے کہ جعفر کے ابا، اپنے بھائی کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔

”آپ بھی تو آستین میں سمانپ پالتے ہیں۔ اتنے کمینے لوگوں کو اپنے ہاں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس روز تمہاری نوکرائی کی صورت



دیکھی تھی تو فوراً سمجھ گیا تھا کہ یہ بڑی چالاک اور مکار عورت ہے۔

”جی نہیں۔“ فریدہ کے ابا بولے۔ ”وہ بے چاری تو..... اتنا ہی سنا تھا کہ جعفر کے ابا غصے سے بولے۔

”آپ پھر اس کی حمایت کر رہے ہیں بھائی جان! اسی نے تو اپنے بیٹے کو سکھایا تھا۔ ماں کے کہنے پر ہی اس سانپ کے بچے نے ہماری فریدہ کو ڈسنے کی کوشش کی۔“

”لیکن طارق کی ماں کو ہم سے کیا دشمنی تھی؟“

”آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں۔“ جعفر کے ابا نے کہا۔ ”حضور اس کا

خیال تھا کہ فریدہ دریا میں..... (خدا نہ کرے) ڈوب جائے گی اور آپ کی

ساری دولت طارق کے قبضہ میں آجائے گی۔“

یہ بات سن کر فریدہ کے ابا سوچ میں پڑ گئے۔ جعفر کے ابا نے کہا۔

”آپ اس عورت کو یہاں بلائیں۔ میں ابھی اس سے پوچھتا ہوں۔“ جعفر نے جلدی سے جواب دیا۔ ”طارق کی ماں اپنے بیٹے کے

ساتھ یہاں سے چلی گئی۔“

”دیکھا؟“ جعفر کے ابا فوراً بولے۔

”وہ جھوٹی تھی۔ اس کے دل میں کھوٹ تھا۔ اس لیے بھاگ گئی ہے۔“

”وہ تو.....“ فریدہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن جعفر کے ابا نے اسے بولنے نہیں دیا۔ وہ کہنے لگے۔ ”اچھا ہوا وہ دونوں دفع ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو دشمنوں سے بچالیا۔ ہماری بیٹی فریدہ بھی غمگینی۔ میں اس خوشی میں آج شام کو شان دار پارٹی دوں گا۔“ یہ باتیں کرنے کے بعد جعفر کے ابا جعفر کو ساتھ لے کر واپس چلے گئے۔

رات کو فریدہ کے ابا، امی اور فریدہ، جعفر کے گھر میں کھاپی رہے تھے۔ اسی وقت طارق اور اس کی ماں، ابا کے بیٹے کے گھر میں بیٹھے تھے۔ طارق کی ماں کے آنسو تو تھمتے ہی نہ تھے۔

تموڑی ہی در بعد طارق کی ماں نے اپنے بیٹے سے کہا۔

”اب ہم اسکول کی لیس اور ہمیں کر سکیں گے۔ وہ اتنا اونچا اسکول ہے تم اسے چھوڑ کر کسی بستے اسکول میں داخل ہو جاؤ۔“

یہ سن کر طارق کو بہت دکھ ہوا۔ اسے اپنے اسکول سے بڑی محبت تھی۔ وہ خاموش رہا۔ ماں نے کچھ سوچا اور بولی۔

”چلو..... تمہاری اُستانی کے پاس چلتے ہیں۔ ان سے کہیں گے کہ وہ تمہیں اسکول چھوڑنے کی اجازت دے دیں۔“ ماں اور بیٹا جب اُستانی

صاحبہ کے پاس پہنچے تو وہ دونوں کو دیکھ کر بہت خیران ہوئیں۔ بولیں۔

”طارق بچے! کیا بات ہے تم اتنے پریشان کیوں ہو؟“ طارق کی ماں نے کہا۔

”میں اس کی ماں ہوں۔ میرا بیٹا آپ کا اسکول چھوڑ کر.....“

”ہمارا اسکول چھوڑ کر؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

”جی ہاں..... میں اپنے بیٹے کو کسی دوسرے اسکول میں داخل کر اؤں گی۔“

”مگر کیوں؟“ اُستانی اور بھی خیران ہو کر بولیں۔ ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ طارق کو ہم سے چھیننا چاہتی ہیں؟“ طارق کی

ماں کوئی جواب نہ دے سکیں۔ اُستانی صاحبہ بولیں۔ ”طارق ہمارا بیٹا اچھا شاگرد ہے۔ ہم اسے اپنے اسکول سے نہیں جانے دیں گے۔“

”لیکن.....“ ماں کچھ کہنے ہی گئی تھیں کہ ان کا گھر آگیا۔ انہوں نے بولنے کی بہت کوشش کی لیکن بول نہ سکیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

2 ستمبر 2014

"کیوں کیا بات ہے، بہن جی؟" استانی نے نرمی سے کہا۔

"آپ روکیوں رہی ہیں؟" اپنی اماں کو رونا دیکھ کر طارق کی آنکھیں بھی ہمیک گئیں۔ استانی جی نے طارق کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ "طارق بیٹے! کیا بات ہے، آخر آپ لوگ بتاتے کیوں نہیں؟" استانی کو اس قدر مہربان پاکر ماں کے منہ سے نکل گیا۔ "میرے بیٹے کی جان خطرے میں ہے۔" یہ سن کر استانی پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے پوری پوری ہمدردی ظاہر کی اور ہر طرح سے طارق کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ طارق تو میرا اپنا بیٹا ہے۔ یہ باتیں سن کر طارق کی ماں کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی استانی کو سنا دی۔

استانی کچھ دیر تک گم صم بیٹھی رہیں، پھر بولیں۔

"میں نے طارق کو بچانے کا ذمہ لیا ہے۔ میں ابھی جا کر فریدہ کے ابا جان سے بات کرتی ہوں۔"

"ایسا نہ کیجئے،" طارق کی ماں نے کہا۔ "اس طرح تو جعفر کے ابا آپ کے بھی دشمن بن جائیں گے۔" یہ سن کر استانی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور طارق کی ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "بہن جی! میں استانی ہوں۔ میں نے ہمیشہ بچوں کو سچ بولنے کا سبق دیا ہے۔ میں اسکول میں بچوں کو بہادر بننے کے لیے کہتی ہوں۔ میں خود سچ بولنے سے ڈروں گی تو میری بات کسی بچے پر اثر نہیں کرے گی۔"

"استانی جی، جعفر کا باپ بہت امیر آدمی ہے۔ وہ....."

"امیر آدمی تو ہے لیکن لالچی اور ظالم ہے۔" استانی نے کہا۔ "اور ظالم آدمی ہمیشہ ڈر پوک ہوتا ہے۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" استانی نے طارق اور اس کی ماں کو رخصت کیا اور خود ایک تانگے میں بیٹھ کر فریدہ کے گھر کی طرف چل پڑیں۔ انہوں نے کوٹھی کے باہر تانگہ ڈکویا۔ پچانک کے پاس اندھیرا تھا۔ استانی صاحبہ اندر داخل ہونے لگیں تو اندھیرے میں ایک شخص ان کی طرف بڑھا۔

"تم کون ہو؟"

"میں فریدہ کی استانی ہوں۔" استانی نے دلیری سے جواب دیا۔

"یہاں کیوں آئی ہو؟" آدمی نے غصے سے پوچھا۔

"میں فریدہ کے ابا سے ملنے آئی ہوں۔ طارق سے متعلق....."

استانی نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس آدمی نے پستول نکال لیا اور استانی کی طرف پستول کی نالی کر کے بولا۔

"خبردار..... ہمیں سے واپس چل جاؤ۔ اسی وقت فوراً۔" اگلے دن صبح کو طارق اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ طارق کا نیا گھر

اسکول سے بہت دور تھا۔ ڈور تو پہلا گھر بھی تھا لیکن وہاں یہ آسانی تھی کہ وہ فریدہ کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اسکول جاتا تھا۔ اس لیے وہ اور فریدہ بہت جلد اسکول پہنچ جاتے تھے۔ طارق کو اس کی ماں نے آج منہ اندھیرے ہی جگا دیا تھا۔ طارق کو اتنی جلدی بستر سے اٹھنے میں تکلیف ہوئی۔ رات کو وہ بہت دیر سے سویا تھا کیوں کہ وہ رات کو اپنی ماں کے ساتھ استانی صاحبہ کے گھر گیا تھا۔ اس کی نیک اور مہربان استانی نے طارق اور اس کی ماں کو تسلی دی تھی۔ استانی صاحبہ اسی وقت فریدہ کے ابا کو اصلی بات سچ سچ بتانے کے لیے فریدہ کے گھر گئی تھیں۔ طارق آج روٹی کھا کر جلدی اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اس کی ماں نے اسے سمجھایا۔ "بیٹا! ہم غریب ہیں لیکن غریب ہونے کے ساتھ ساتھ عزت والے بھی ہیں۔ تمہارے باپ نے ساری زندگی محنت کی ہے۔ حلال کی کمائی کھائی ہے۔ وہ بھی دوسروں کی دولت دیکھ کر مایوس یا دکھی نہیں ہوا۔"

"میرے ابا نے میرے متعلق بھی کچھ کہا تھا؟" طارق نے اپنی ماں سے سوال کیا۔ اپنے بیٹے کا سوال سن کر ماں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا پھر بولی۔ "ہاں بیٹا! تو جب پیدا ہوا تھا تو تیرے ابا بہت خوش تھے۔ وہ کہتے تھے۔ میں اب اور بھی زیادہ کام کروں گا۔ میں دن رات محنت کر کے اپنے بیٹے کو خوب پڑھاؤں گا۔ اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنائوں گا۔"

"فریدہ کے ابا کی طرح نکاح بڑا آدمی۔" طارق نے پوچھا اور ماں نے جواب دیا۔ "بڑے آدمی دولت سے نہیں بنتے میرے لال! علم اور نیکی سے بنتے ہیں۔ علم حاصل کرنے کے لیے محنت ضروری ہے۔ دنیا میں وہی لوگ بڑے ہوئے ہیں جنہوں نے زور کھی سوکھی کھا کر عزت حاصل کی ہے۔ دوسروں کے ساتھ نبھائی کی ہے۔ تو خوش نصیب ہے کہ تجھے اتنی اچھی استانی ملی ہے۔ تم ذرا سوچو کہ وہ بیماری کیا لگتی ہے لیکن اس نے ہمارے بچے کے لیے اپنا آرام چھوڑ دیا اور فوراً فریدہ کے ابا سے ملنے چلی گئی۔" طارق اب پیدل اسکول جا رہا تھا۔ سارا راستہ اس کے سامنے استانی کی محبت بھری آنکھیں اور طارق کا چہرہ آتا رہا۔ طارق نے سوچا، ماں نے ٹھیک کہا ہے میری مس بہت نیک اور اچھی عورت ہیں۔ انہوں نے جا کر فریدہ کے ابا کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ فریدہ کے ابا بھی نیک آدمی ہیں۔ انہیں سچ چل گیا ہو گا کہ جعفر اور اس کے ابا ہمارے دشمن ہیں اور یہ ساری شرارت جعفر ہی کی ہے۔ طارق اسکول کے گیٹ پر پہنچا تو وہاں جعفر کی کار کھڑی تھی۔ جعفر کی گھر طارق پر پڑی تو جعفر بڑا حیران ہوا۔ پھر اسے غصہ آ

کیا۔ وہ جلدی سے طارق کی طرف آیا اور بولا۔ "تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟" طارق نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ منہ دوسری طرف پھیر کر اسکول کے چھانک سے گزرنے لگا۔ جعفر اس کے پیچھے آیا اور بولا۔
 "تم اس اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔"
 "کیوں نہیں پڑھ سکتا؟" طارق بھی غصے سے بولا۔
 "تمہاری فیس اب کون دے گا؟"
 "تمہیں اس سے کیا۔"

"مجھے کیا؟" جعفر نے کہا۔ "پہلے تو میرے تایا کے مال پر نیش کرتے تھے اب تمہاری ماں کو ہم نے نوکری سے نکال دیا ہے۔ اب تم دونوں بھوکے مرد گے۔" یہ سن کر طارق زک گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ گرج کر بولا۔
 "بکواس مت کرو ورنہ..." اس سے آگے طارق کچھ نہ کہہ سکا۔ غصے سے اس کا جسم کانپنے لگا اور منہ سے لکھے ہوئے لفظ نکل گئے۔ جعفر نے دیکھا کہ طارق اس قدر غصے میں ہے تو وہ گھبرا گیا۔ جعفر کو یاد آ گیا کہ کچھ دن پہلے اسکول کے اسی چھانک پر طارق سے اس کی لڑائی ہوئی تھی اور طارق کے ساتھ دوسرے لڑکے بھی جعفر پر ہل پڑے تھے۔ جعفر نے سوچا اب پھر میری پٹائی ہو جائے گی۔ وہ چپ ہو کر جلدی سے جماعت کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ کچھ بچوں نے جو اسکول میں داخل ہو رہے تھے، طارق اور جعفر کی باتیں سن لی تھیں۔ ایک لڑکا بولا۔

"لو بھئی، جعفر صاحب دم دبا کر بھاگے۔" شریر لڑکا، جس نے ایک روز جعفر کو کرسی سے گرایا تھا، ایک کر جعفر کے پیچھے آیا اور اسی کا بازو پکڑ کر بولا۔ "کیوں میاں بیرو طارق کی ٹھکانی نہیں کر دے؟" سب بچے ہنسنے لگے۔ جعفر اپنا بازو چھڑا کر کمرے میں بھاگ گیا۔ طارق جب کمرے میں داخل ہوا تو وہاں فریدہ پہلے سے بیٹھی تھی۔ اس نے طارق کو دیکھا تو زور سے ہولی۔

"طارق بھائی!" یہ کہہ کر فریدہ جلدی سے طارق کی طرف بڑھی۔ "تم رات کو کہاں چلے گئے تھے؟" یہ دیکھ کر جعفر، فریدہ کے پاس آیا اور بولا۔ "تم ابھی تک اس سے باتیں کرتی ہو۔" فریدہ خاموش ہو گئی لیکن وہ طارق کا منہ دیکھ کر جاری تھی۔ طارق نے سوچا رات کو اسٹانی کھنٹی بھی اس سے ملنے لگی تھیں۔ انہوں نے سب کچھ بتا دیا۔ صاحب فریدہ کے ابا سے ملنے گئی تھیں۔ انہوں نے سب کچھ بتا دیا۔ فریدہ کے ابا اسی اور فریدہ کو بھی اصل بات کا پتہ چل گیا۔ اسی لیے تو فریدہ مجھ سے باتیں کر رہی ہے۔

دعا کے وقت طارق کی نظریں اپنی استانی کو جاس کرنے لگیں لیکن وہ نظر نہ آئیں۔ دعا ختم ہوئی، سب بچے اپنی بیعتوں میں چلے گئے۔ طارق اپنی جگہ پر بیٹھنے لگا تو فریدہ نے پھر کہا۔
 "طارق تم کہاں چلے گئے ہو؟" طارق جواب دینے ہی لگا تھا کہ جعفر نے غصے سے کہا۔ "تم پھر اس سے بولتی ہو۔ آنا صبح میرے ابا جان نے تمہیں کتنا سبھایا تھا۔"
 "کیا؟" فریدہ بولی۔

انہوں نے نہیں کہا تھا کہ طارق سے کبھی بات نہ کرنا۔ یہ سن کر فریدہ سوچ میں پڑ گئی۔ جعفر پھر بولا۔
 "اب ہم اسے اسکول سے بھی نکلوا دیں گے۔"
 "مجھے اسکول سے کوئی نہیں نکلوا سکتا۔" طارق نے کہا۔
 "نہیں طارق! تمہارا خیال غلط ہے۔" ایک لڑکی نہیں کر بولی۔ "جعفر تمہیں نکلوا سکتا ہے۔"
 "کیوں؟" چند آوازیں آئیں۔

"کیوں کہ وہ بیرو ہے۔" لڑکی نے جواب دیا اور ساری جماعت زور زور سے ہنسنے لگی۔
 "بیرو بھل بڑی طاقت ہے۔" شریر لڑکا بولا۔ "وہ طارق کو تو کیا ہم سب کو اسکول سے نکلوا سکتا ہے۔"
 "کیوں؟" چند آوازیں آئیں۔
 "کیوں کہ ہمارا بیرو چپ کلیاں اور بچے مارتا ہے۔" ساری جماعت نے قہقہہ لگایا۔

"آجے میں استانی کمرے میں داخل ہوئیں۔ سب بچے خاموش ہو کر کھڑے ہو گئے۔ استانی کو کوئی کر سکتے تھے کیوں کہ یہ استانی دوسری کلاس کی تھی۔
 "ہماری مس نہیں آئیں۔" ایک لڑکے نے پوچھا۔
 "نہیں۔" استانی نے جواب دیا۔
 "کیوں نہیں آتی؟" تین چار آوازیں بلند ہوئیں۔

"کیوں کہ تم لوگ بہت شور کرتے ہو۔" دوسری کلاس کی استانی نے ہنس کر جواب دیا۔ بچوں کو اپنی استانی سے بہت محبت تھی۔ جب دوسری کلاس کی استانی نے پڑھانا شروع کیا تو بچوں کا دل پر جمائی نہیں بلکہ رہا تھا۔ بچے سوچ رہے تھے کہ ہماری مس تو کبھی اسکول سے کبھی نہیں کرتیں۔ وہ ضرور بہار ہوگی کیوں کہ جماعت میں سب سے زیادہ پریشان طارق تھا۔ مس کیوں نہیں آئیں۔ کیا وہ بہار پڑ گئی ہیں۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ وہ بولا۔ "مس! ہماری مس بیمار ہو گئی ہیں کیا؟"

طارق کے سلام کا جواب دیا۔ بھر بولیں۔ "بیٹے! کیا حال ہے تمہارا؟"
 طارق نے جلدی سے پوچھا۔ "جی! ہماری مس آج کیوں نہیں آئیں؟"
 یہ سن کر ہیڈ مسٹر لیس نے جواب دیا۔ "میں بھی ان کے نہ آنے
 سے فکر مند ہوں۔ چہرہ اسی دوبارہ ان کے گھر ہوا یا لیکن ان کے مکان
 پر تالا لگا ہے۔"

نہی کے وقت طارق جب واپس گھر جا رہا تھا تو تیز قدم چل رہا
 تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد گھر پہنچ جائے اور اپنی ماں کو بتائے کہ
 ہماری مس آج اسکول نہیں آئیں اور وہ گھر پر بھی نہیں ہیں۔
 ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اسے سامنے سے ایک آدمی آتا
 دکھائی دیا۔ وہ قریب آیا تو طارق نے اسے پہچان لیا۔ یہ مونا تھا۔ مونا
 ہانپ رہا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

"بادشاہ لاکا! میں تجھے بہت دیر سے تلاش کر رہا ہوں۔"
 "کیوں؟" طارق نے پوچھا۔

مونا بولا۔ "ذرا رک کر میری بات سن لے۔ تو تو بھاگا جا رہا ہے
 اور مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ میرا سانس اوپر نیچے ہو رہا ہے۔" طارق
 رک گیا۔ مونے نے ادھر ادھر دیکھا اپنا سانس درست کیا اور بولا۔

"بات یہ ہے، مجھے پتا چلا ہے۔ تیری استانی کو انہوں نے قید کر
 دیا ہے۔" "قید کر دیا ہے؟" طارق گھبرا کر بولا۔ "کس نے؟"
 "جعفر کے ابا کے آدمیوں نے۔" مونے نے کہا۔

"میں جا کر اپنی ہیڈ مسٹر لیس کو بتاتا ہوں۔" طارق نے جلدی سے کہا۔
 "اوائے ہیڈ مسٹر کیا کرے گی۔ مالا بڑا گڑ بڑیشن والا ہے۔ تو
 میرے ساتھ آ جلدی کر۔" اور طارق مونے کی آہنی کے ساتھ چل پڑا۔

"نہیں بیٹے۔۔۔۔۔" استانی نے جواب دیا۔ پھر جلدی سے
 بولیں۔ "مجھے کچھ پتا نہیں، اصل میں ان کی کوئی درخواست نہیں آئی۔
 ہیڈ مسٹر لیس نے ان کے گھر پہنچا ہی بیجا ہے، وہ واپس آئے گا تو پتا
 چلے گا۔ ایک لڑکی کتاب سے لکھیں بنا کر بولی۔"

"کس استانی سے ایک سوال کا جواب آپ دیں گی؟"

"ہاں ہاں! ضرور دوں گی۔ کون سا سوال ہے؟"

"سوال یہ ہے بس؟" دی لڑکی بولی۔ "کیا جعفر کسی دوسرے
 بچے کو اس اسکول سے نکلا سکتا ہے؟" یہ سوال سن کر استانی حیران رہ
 گئیں پھر بولیں۔ "جعفر کون ہے؟"

"ہمارا امیر۔" شری لڑکا جلدی سے بولا۔ "جو چوبے مارتا ہے۔"

بچے ہنسنے لگے۔ استانی صاحب نے بچوں کو چپ کرایا اور بولیں۔

"کوئی بچہ دوسرے بچے کو اسکول سے نہیں نکلا سکتا کیوں کہ
 اسکول کسی کی کوٹھی یا بنگلہ نہیں ہے۔ اسکول علم حاصل کرنے کی جگہ
 ہے۔ اسکول امیر اور غریب، سب بچوں کے لیے ہے۔ بالکل ہمارے
 پیارے وطن کی طرح، جہاں امیر بھی رہتے ہیں اور غریب بھی۔"

"اب بتاؤ امیر دیاں۔" شری لڑکے نے جعفر سے کہا۔

"اب آپ لوگ پڑھائی کی طرف توجہ دیں۔" استانی نے کہا اور
 انہیں پڑھانے لگیں۔ ایک پیریڈ گزر گیا، دوسرا گزر گیا، تیسرا گزر گیا۔
 یہاں تک کہ تفریح کی گھنٹی بج اٹھی۔ طارق کی بے چینی بڑھ گئی۔ وہ
 برآمدے میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ ہیڈ مسٹر لیس وہاں سے گزریں۔

طارق نے انہیں سلام کیا۔ طارق پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔ ویسے بھی
 نیک بچہ تھا، اس لیے ہیڈ مسٹر لیس اسے جانتی تھیں۔ انہوں نے مسکرا کر

مچھلی (Fish)

مچھلی قدیم ترین ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے مخلوق ہے خون والی جانوروں میں سے ہے۔ مچھلیوں کی ارتقا 620 ملین سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ مچھلی پانی والی تمام مچھلیوں
 تالاب، جوہر مندی، لے اور نہر، دریا اور سمندر وغیرہ میں رہتی ہیں۔ مچھلی کا گوشت بہت لذیذ اور غذاہیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ مچھلی مچھروں کے ذریعے پانی کے اندر مخلوق آکسیجن
 اپنے جسم کے اندر لے جاتی ہے۔ کچھ مچھلیاں اپنے جسم کے اندر لے جاتی ہیں۔ پانی میں مچھلیاں اپنی دم کو دائیں بائیں حرکت دے کر تیرتی ہیں اور نہروں کی مدد سے اپنا
 توازن برقرار رکھتی ہیں۔ پر مچھلی کی طرح مچھلیاں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جرت کرتی ہیں۔ بعض مچھلیاں رنگ وادار بہت دل کش ہوتی ہیں اور لوگ انہیں اپنے گھروں میں کسی
 برتن یا شے کے چار میں سجاتے ہیں۔ لے دیکھ کر مچھلیوں کے پڑاؤ میں مچھلی بڑی کی بڑی ہوتی ہے۔ ہاتھ اور پیروں کی جگہ پودوں کے جواز سے
 ہوتے ہیں۔ ان کا جسم مچھلوں سے لکڑی کا ہوتا ہے جو ایک دوسرے پر چڑھتے ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھوں پر پتے نہیں ہوتے۔ یہ اپنے تقنوں کو سانس لینے کے بجائے سونگھنے
 کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ شادک ایک بہت بڑی جسامت کی مچھلی کی اسم ہے جو کہ اپنی بڑی جسامت کی وجہ سے مچھروں، کشتی، بان اور بحری جہاز وغیرہ کے لیے خطرے کی علامت
 ہے۔ اس کے علاوہ مچھلی اور ان کی بڑی جسامت کی مچھلیوں کے لیے مشہور ہے۔ مچھلی کا نقش مریاں جانوروں سے بجا رہا انتہائی اوشیا اور پانی کا جانور ہے۔ وہ ان مچھلی بھی
 بڑی جسامت کی بہت بڑی اور انسان دوست ہے۔ وہ ان کی بلوں کے سمندر اور پانی میں پانی جاتی ہے۔ مچھلی کے منہ کے قریب وہاں لے گئے ہوتے ہیں جن سے مچھلی بچنے کا
 کام لیتا ہے۔ اس کی زبان اتنا لہو اور گلوب نہیں بھی دانت ہوتے ہیں۔ مچھلی پانی کی کان کی گھاس اور بڑی بڑی مچھلیوں پر گزرا کرتی ہے اور بعض بڑی مچھلیاں مچھلیوں کو کھا کر اپنا
 پیٹ بھرتی ہیں۔ کچھ مچھلیوں کے مچھروں کے نزدیک چھتیاں لگی ہوتی ہیں۔ ان میں سے پانی تو ہمیں جاتا ہے لیکن چھوٹے چھوٹے جانور پیچھے رہ جاتے ہیں جنہیں مچھلیاں کھا جاتی
 ہیں۔ دنیا کے مختلف ادب میں مچھلی کا بہت زیادہ ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں بھی مچھلی کا ذکر ہے۔ دنیا میں مچھلیوں کی سب سے بڑی اقسام دریا، تالاب اور مچھلی ہیں جن
 میں پانی کے علاوہ مچھلیاں شکل پر دیکھتی ہیں اور خوشی پر بھی چڑھتی ہیں۔



اب جب بھی بھائی کام سے فارغ ہوتے تو بہن زیادہ وقت بھائی کے پاس ہی گزارتی۔

محترمہ فاطمہ جناح 31 جولائی 1893ء کو کراچی کے یونہام روڈ پر واقع ایک عمارت میں پیدا ہوئیں۔ جناح بھائی کے برادر شہتی قاسم موسیٰ نے بڑے بیٹے کا نام محمد علی تجویز کر کے خاندان میں اسلامی نام رکھنے کی ابتداء کر دی تھی، چنانچہ اس بچی کا نام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء سے عقیدت و محبت کے اظہار کے طور پر فاطمہ رکھا گیا۔ خاندان کے کئی افراد نے اس نام کو پسند کیا۔

فاطمہ جناح کی پیدائش پر خاندان کے کئی لوگ خوش تھے۔ فاطمہ جناح کے بڑے بھائی محمد علی جناح اس وقت انگلستان میں زیر تعلیم تھے، چنانچہ بہن کی پیدائش کی خبر انہیں ملی تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ اپنے خط میں تعلیم مکمل ہونے کے فوراً بعد واپسی کا عندیہ دیا اور اپنی ننھی مٹی بہن کے لیے ڈھیروں پیار اور دعائیں لکھیں۔

بچپن میں فاطمہ کو چاکلیٹ بہت پسند تھی۔ کبھی کبھار تو وہ

”میرا بھائی محمد علی کیسا ہے؟“ ننھی فاطمہ اپنی بڑی بہن مریم جناح سے پوچھتی۔

”فاطمہ تم یوں سمجھ لا جیسے چاند کا ٹکڑا ہو۔“ بڑی بہن کہتی۔

”اچھا، میرا بھائی باتیں کیسی کرتا ہے؟“

”دل چپ اور مزے مزے کی باتیں کیوں کہ وہ زیادہ پڑھتے لکھتے رہتے ہیں، پھر جب باتیں کرنے لگیں تو اتنی میٹھی باتیں کرتے ہیں گویا کوئی لودی دے رہا ہو۔“

یوں فاطمہ اپنے بھائی کے متعلق مختلف سوالات، تصورات و خیالات سے خود کو بہلاتی رہتی۔ بہن، بھائی کی یہ محبت بچپن سے ہی مضبوط ہوتی چلی گئی۔

1896ء کے ایک چمکیلے دن فاطمہ کو خبر ملی کہ ان کے بھائی انگلستان سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس آ رہے ہیں۔ فاطمہ کی خوش دیدنی تھی۔ ننھی فاطمہ نے اپنے بھائی کو کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ بھائی نے آگے بڑھ کر بہن کو گود میں اٹھالیا۔ محمد علی نے اپنی بہن فاطمہ کو ڈھیروں پیار دیا، تحفے دیے اور میٹھی میٹھی باتیں کیں۔

پہنے لکھنے پڑھنے میں مصروف تھیں۔ کچھ بچیاں مسجد میں کھیل رہی تھیں۔ بھائی نے بہن کو اسکول کے مختلف حصے تھیں دیکھائے اور ظاہر یہی کیا کہ یہ شخص ایک سیرتھی۔

بھائی نے یہ مثل کئی بار دہرائی۔ وہ ہمیں گھر سے گزرتے کراتے اسکول تک لے جاتے اور وہاں پہنچ کر ہمیں دیکھ دیتے۔ فاطمہ جناح بچیوں کو پڑھتے لکھتے اور لکھتے کہوتے دیکھتی رہتی۔ آہستہ آہستہ فاطمہ کی ہچکچاہٹ و خوف زور سے گھبراہٹ تھیں۔ اس لیے بھائی سے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ ان بچیوں کے ساتھ پڑھنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ محمد علی جناح نے انہیں مسیحا کے ہاتھوں کا نوہنٹ اسکول میں داخل کروا دیا اور بورڈنگ میں ان کی رہائش کا بھی انتظام کر دیا۔ چھٹی والے دن یعنی اتوار کو بھائی بہن سے ملنے ضرور جاتے اور ان کی بہت حوصلہ افزائی کرتے۔

”جو بھی فیصلہ کر لیا جائے اس پر سختی سے قائم رہنا چاہیے۔“ یہ عملی زندگی کا وہ پہلا سبق تھا جو فاطمہ نے اپنے بھائی سے حاصل کیا۔ پڑھائی پر توجہ، اچھے اخلاق و کردار سے بہت جلد فاطمہ نے اپنے استادوں کے دل میں خاص جگہ بنائی۔ یہی کوئٹہ اور ہریک کے کام آنے سے فاطمہ جناح کی زندگی میں گئی۔ چنانچہ جب بھی بھائی ان سے ملے آتے تو فاطمہ کے استاد اس کی بے حد تعریف کرتے۔

کوئٹہ اسکول میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد محمد علی جناح نے انہیں سینٹ پیٹرک اسکول کھٹلا میں داخل کرا دیا۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کا وجہ سے فاطمہ کے استاد محمد علی جناح سے کہتے کہ وہ بہن کی تعلیم جاری رکھیں۔ سینٹ پیٹرک اسکول سے 1910ء میں فاطمہ جناح نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ یہ بھی انہیں انہوں نے بورڈنگ میں ہی قیام کیا۔ میٹرک کے بعد وہ اپنے بھائی محمد علی جناح کے پاس آئیں۔ محمد علی جناح کے لیے اپنے خدائی و کائناتی مصروفیات میں سے وقت نکالنا بہت مشکل تھا مگر محمد علی جناح نے اپنی چھوٹی بہن کے لیے ہر لمحہ کچھ وقت ضرور نکالتے۔ فاطمہ سے دھیروں باتیں کرتے، بلکہ سبکدوشی سے ان کی دل چاہی کرتے۔ یوں فاطمہ کو محسوس نہ ہوئے دیتے کہ وہ اس پر توجہ نہیں دے رہے۔

محمد علی جناح جب صبح ہائی کورٹ جاتے تو فاطمہ جناح کو بھی سبھی میں

چاکلیٹ کا ہارایک ہی کہا جاتی۔ اسی طرح سائیکل چلانا بھی بہت پسند تھا۔ اکثر وہ پہر کو سائیکل چلا کر خوش ہوتی تھی۔ بھائی کا بھی تقریباً معمول تھا کہ دفتر سے گھر آتے تو فاطمہ کی پسند کی چاکلیٹ ضرور لاتے۔ چھٹی کے دن فاطمہ کو باہر گھمانے لے جاتے، جہاں سائیکلنگ کا شوق بھی پورا ہو جاتا۔

عام بچیوں کی طرح فاطمہ کو بھی بچپن میں گزیوں کے کھیل سے دل چسپی نہیں تھی بلکہ وہ اپنے بھائی محمد علی کی طرح فارغ وقت میں مطالعہ کرتی اور معلومات میں اضافہ کر کے خوش ہوتی۔ بچپن میں فاطمہ بہت ضدی تھی مگر اس ضد سے کسی کو نقصان نہ پہنچاتی تھی۔ البتہ لباس کے معاملے میں بہت زیادہ نفاست پسند تھی۔ 1900ء میں عارضی مجسٹریٹ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد محمد علی جناح کی کامیابیوں کا سفر آگے بڑھا تو انہوں نے کراچی سے والد اور بہن بھائیوں کو بھی بلا لیا۔ فاطمہ جناح کی عمر اس وقت سات سال تھی۔

اللہ تعالیٰ نے فاطمہ جناح کو بچپن ہی سے سوجھ بوجھ عطا کی تھی، چنانچہ اپنی گفتگو سے وہ مختلف مسائل و معاملات کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ آپ کے والد نے معاشرے کی تنقید سے بچنے کے لیے بیٹی کو ابتدائی تعلیم گھر پر ہی دینے کا فیصلہ کیا۔ فاطمہ جب دو سال کی تھی تو والدہ وفات پا گئیں۔ اب 1901ء میں کھٹلا میں عمر میں والد بھی انتقال کر گئے تو بہن کی تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری بڑے بھائی محمد علی جناح پر آن پڑی۔

محمد علی جناح چاہتے تھے کہ بہن کو جدید تعلیم ملے اور دانش کراچی کے لیے انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ معاشرتی و خانگی دباؤ کے بعد محمد علی جناح نے فاطمہ جناح کو مدرسنہ بونے دیکھا تو ان کا حوصلہ بڑھایا۔ آپ چاہتے تھے کہ بہن پر انگریزی تعلیم کا فیصلہ زبردستی نہ تھوپا جائے بلکہ ایسا ماحول دیا جائے کہ وہ از خود اس طرف راغب ہوں۔

بہن کی ہچکچاہٹ دور کرنے کے لیے بھائی نے ان کو کھلا طریقہ اختیار کیا کہ ایک دن فاطمہ کو کبھی میں کھانا کھانے کے لیے مدرسنہ اسکول تک لے گئے۔ وہاں تھوڑی دیر کے لیے کبھی روک دی۔ فاطمہ نے دیکھا کہ بہت سی بچیاں جوان کی ہم عمر تھیں، خوب صورت لباس

بٹھا لیتے تاکہ وہ ان کی غیر موجودگی میں خود کو اکیلا محسوس نہ کریں۔ راستے میں وہ فاطمہ کو بڑی بہن، بیگم مریم عابدین کے ہاں چھوڑ دیتے تاکہ وہ بہن اور ان کے بچوں کے ساتھ بھی خوشی دن گزاریں۔ عدالت سے واپسی پر فاطمہ جناح کو وہاں سے لے لیتے تھوڑا وقت سیر و تفریح میں گزارتے یہ دوپہر کے کھانے کے لیے گھر پہنچتے۔ کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرتے اور شام کو میر کے لیے نکل جاتے۔ اس عرصے میں فاطمہ جناح اپنی پڑھائی سے دور نہ ہوئیں۔ انہوں نے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر سینئر کیمبرج کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ اپنی بہن کے گھر کتابیں لے جائیں اور فراغت میں پڑھائی شروع کر دیتیں۔ 1913ء میں انہوں نے نئی امیدوار کے طور پر امتحان پاس کیا۔ محمد علی جناح نے نتیجہ دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور چھوٹی بہن کو مبارک باد کے ساتھ تحائف بھی دیے۔

بچپن میں بہترین تعلیم و تربیت دینے والے بھائی کو علی زندگی میں جب بہن کے ساتھ کی ضرورت پڑی تو بہن نے بھرپور ساتھ

دیا۔ بہن بھائی کے مشاغل ایک جیسے تھے۔ دونوں مطالعے کے شوقین تھے تو دونوں کا پسندیدہ موضوع سیاست ہی تھا۔ فاطمہ جناح نے اپنا ڈسپلن کلینک چھوڑ کر بھائی کی برہنہ جاتی ہولی سیاسی مصروفیات میں ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ تحریک پاکستان کے ہر محاذ پر بھائی کے شانہ بشانہ رہیں۔ فاطمہ جناح نہ صرف ان کے معمولات و مصروفیات کا خیال رکھتیں بلکہ مفید مشورے بھی دیتیں۔ قیام پاکستان کے بعد قائد اعظم کی بیماری کے ایام میں ان کی تدارداری کا فریضہ فاطمہ جناح نے بخوبی نبھایا۔ عظیم بھائی کی عظیم بہن نے اپنی زندگی لوگوں کی بہتری و بھلائی کے لیے وقف کر دی۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے صدارتی انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ کراچی میں پیدا ہونے والی فاطمہ جناح نے آخری سانس بھی کراچی میں ہی لیا۔ 9 جولائی 1967ء کو ان کا انتقال ہوا اور انہیں ان کے بھائی قائد اعظم محمد علی جناح کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

☆

بھائی بھائی

زندگی برباد کرنا کسی طور بھی عقل مندی نہیں۔
 "تو اب آپ کیا کریں گے؟" نصیر نے سوال کیا۔
 "میں تم سب کو تمہارے گھروں تک پہنچاؤں گا۔" اس نے مذہم لہجے میں کہا۔ "تمہارے والدین تل تل کر تمہارے مسائل حل کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے ارادے نیک تھے۔"
 "ہم اپنے گھر جائیں گے؟" یا سر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔
 "میں اپنے گھر جا سکوں گا۔" نصیر نے تو نور اچھے جانے کی تیاری شروع کر دی۔

"میرا گھر..... ایک اور لڑکا بھی خوشی سے بولا۔

"مجھے بھی ای بہت یاد آ رہی ہے۔" جنید تو آنسوؤں سے رو دیا۔
 اس کے اس اعلان نے بچوں کے اندر خوشی کی نئی لہر دوڑا دی۔ وہ سب ایسے ہو گئے جیسے آج ہی انہوں نے اس دنیا میں جنم لیا ہو۔ استاد خاموشی سے اٹھا اور اپنے ارادے کی تکمیل کی تیاری کرنے لگا۔ اس کا فیصلہ تھا کہ وہ اب بچوں کو اندر حیرتوں سے اجالوں کی طرف لے جائے گا۔

○○○○

ان کا بہت خیال رکھتے ہیں، میرے اندر بھائیوں سے نفرت کا جو لاوا پک رہا تھا وہ ایک جانب بیٹھا شروع ہوا۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ محض چند لوگوں کے غلط رویے کی سزا سادے معاشرے کو دینا کسی طور درست نہیں۔

"ہوں! ایک بچے نے ہٹکارا بھرا۔

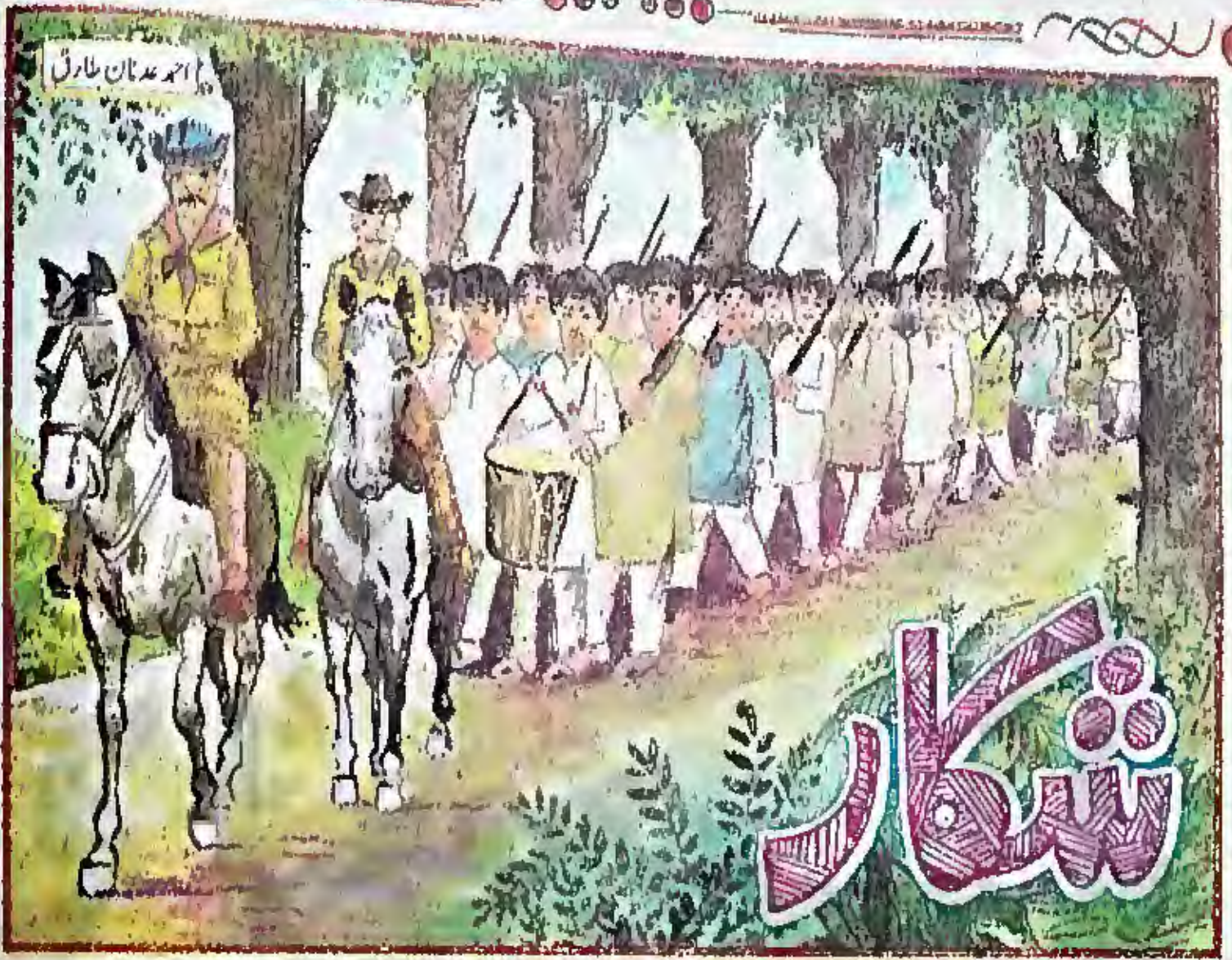
"میں نے تم لوگوں کو بھی اپنی نفرت کی بھیٹ چڑھایا۔ تم نے بھی بہت سے حسین خواب دیکھے ہوں گے لیکن مجھ جیسے گناہ گار نے تمہیں بھکاری بنادیا۔ میں جن اجالوں کی تلاش میں نکلا تھا وہ خود تو نہ پاسکا بلکہ دوسروں کو بھی اس سے محروم کر دیا۔"

"اللہ آپ پر رحم فرمائے۔" نصیر بھی چپکے سے بول پڑا۔

"اب میں نے دل میں بھان لی ہے کہ تم لوگوں کو آجائے کی طرف لے جاؤں گا۔"

"وہ بھلا کیسے؟"

"تمہاری منزل تو تمہارے گھر میں ہے۔ والدین کی بار آورختی میں بھی اپنائیت ہوتی ہے۔ ماں باپ کی اربنتر ہے لیکن گھر سے بھاگ کر اپنی



طور پر قتل ہو کر سوچنے لگا کہ میں کیسے بھول گیا؟ میں نے موسمو کو بتایا تو اس نے کہا کہ اگر تم بھول گئے ہو تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں نے موسمو کو آگاہ کیا کہ میں نے رات تراویح بھی ادا نہیں کیں اور اب بھوک سے میرا برا حال ہے، تب ذیٹ جی اس گفتگو میں شریک ہوا۔ اس نے مجھے کہا کہ اگر میں روزہ نہیں رکھ سکا تو پھر کوئی بہانہ نہیں کرنا چاہیے۔ آؤ باورچی خانے میں جا کر دیکھتے ہیں کہ شاید وہاں رات کا کچھ بچا ہوا ہو۔

باورچی خانے میں ہمیں تھوڑا سا سوپ اور کچھ ابلے ہوئے چاول ملے جنہیں میں نے بادل نخواستہ زہر مار کیا۔ پھر ہم باورچی خانے سے نکلے اور ایک برسری کے قریب سے گزرے تو ہم نے بوڑھے سوانا کی آواز سنی۔ وہ وہی قصہ سنابھ تھا، جس میں اس کے پیچھے ایک گینڈا لگ گیا تھا۔ لوگ یہ قصہ سن کر ہنس رہے تھے۔ ہم وہیں رک گئے اور سوانا کو کہا کہ وہ ہمیں یہ قصہ دوبارہ سناے۔ اس نے ہمارے لیے قصہ دوبارہ شروع کیا۔

بہت سال پہلے کی بات ہے جب میں جوان تھا، تب یہ خواہ گروڑ میں تھی کہ قریبی جنگل میں کچھ گینڈے دیکھے گئے ہیں۔ ہمارا مالک جو ذیٹ جی کا باپ تھا، اس نے ایک شخص کو جنگل کا جائزہ لینے

رائو گینڈے کی ایک قسم ہے جس کے ماتھے پر ایک سینک ہوتا ہے۔ گینڈے کی یہ قسم آہستہ آہستہ دنیا سے ناپید ہوتی جا رہی ہے اور اب انڈونیشیا کی حکومت اسے بچانے پر خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ گینڈے کی یہ نسل صرف انڈونیشیا کے ایک جزیرے جاوا میں پائی جاتی ہے۔ 1932ء میں گینڈے کے شکار پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ انڈونیشیا میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے۔ یہ ماہ رمضان کا واقعہ ہے۔

اس دن میں اپنے معمول سے ہٹ کر صبح دیر سے بیدار ہوا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور فضا میں حدت بڑھ رہی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں تیار کر رہا تھا مگر زور زور سے میرے ناشتے کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں اسی طرح حیران باہر باسیچے میں نکلا اور پھر پورے گھر کے گروڑ چکر لگایا۔ باورچی خانے کی کبڑی اسے جھانکا لیکن باورچی خانے میں کچھ پکنے کی خوشبو نہیں آ رہی تھی۔ اسی حیرانی میں میں نے سگریٹ لگایا اور اسی وقت موسمو اور ذیٹ جی باسیچے میں داخل ہوئے۔

موسمو مجھ سے حیران ہو کر پوچھنے لگی کہ تم سگریٹ کیوں پل رہے ہو؟ میں نے اسے بتایا کہ مجھے ناشتے سے پہلے ایک سگریٹ پینے کی عادت ہے تو اس نے مجھے یاد دلایا کہ آج پہلا روزہ ہے۔ میں ڈنکی

سب نے رات کو قیام کرنا تھا۔ جب گاؤں کے لوگ پیچھے تو نہیں
 خلف گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پھر وہ گروپ مختلف سمت میں پھیل
 گئے۔ صرف وہی لوگ وہاں رہ گئے جو چھوٹی نما گھر بنا رہے تھے۔
 ہر گروپ کے ساتھ ایک گاؤں کا کھیا اور ایک سرکاری افسر جو اسلحہ سے
 لیس تھا۔ ان سارے گروپوں کے پاس سب ملا کر بیس ہندو قس
 تھیں۔ دائرے اور دوسرے سرکاری ملازمین بھی اس خفیہ مقام کی
 طرف روانہ ہو گئے جہاں ان کے بیٹے کے لیے زمین سے بلند مچان
 بنائی گئی تھی۔

مچان کیا تھی، ہوا میں معلق ایک گھر بنا دیا گیا تھا جسے قریبی
 درختوں کے تنوں کے ساتھ رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ شکاریوں کو
 واضح شکار نظر آنے کے واسطے مچان کے سامنے کی جھازیاں کاٹ دی
 گئی تھیں تاکہ وہ آسانی سے نشانہ باندھ سکیں۔ یہ چھپنے کے لیے اب
 بری ذرہ سب جگہ تھی۔ اگر ان شکاریوں کی رائفلوں کی پہنچ میں کوئی
 گینڈا آتا تو وہ ان کے ایک اچھے نشانے کی مار ہوتا۔ سارا دن دور
 دور ہر طرف ڈھول تاشوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ یہ ہانکا
 کرنے والوں کی آوازیں تھیں جو گینڈوں کو ہانک کر مچان کی طرف لا
 رہے تھے۔ اگرچہ اس دن کوئی نتیجہ نہ نکل سکا تو اگلے دن پھر یہ تماشا
 شروع ہو گیا۔ ہانکے والوں کی آوازیں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگیں
 لیکن اس دن بھی کوئی گینڈا نظر نہ آ سکا۔ اگلے دن صبح سویرے قریبی
 گاؤں سے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے ہمیں بتایا کہ گینڈے گاؤں
 کے نزدیک دیکھے گئے ہیں۔ کھوجی بھیجے گئے تو انہوں نے بتایا کہ
 گینڈے گاؤں سے اسی طرف آئے ہیں، جدھر مچان بنی گئی ہیں۔

ہانکا کرنے والوں نے جنگل میں بنائی ہوئی جگہ سے ہانکا کرنا
 شروع کر دیا۔ کھوجیوں نے شبیہ کر لیا کہ اس بار وہ گینڈوں کو غائب نہیں
 ہونے دیں گے۔ اب سب کو یقین تھا کہ گینڈے ہانکے کے درمیان
 موجود ہیں۔ مچان پر بڑے مشتاق شکاری موجود تھے اور سب شدت
 سے گینڈوں کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر جنگل میں مغرب اور مشرق کے
 اطراف کی جھاز یوں کو آگ لگائی گئی۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی جس
 نے آگ کو اور تیز کر دیا اور آسمان کی طرف دھواں جانا شروع ہو گیا۔
 آگ کے پھیلنے سے ہر طرف جھاز یوں کے دھنکے کی آوازیں آنے
 لگیں اور دھوئیں سے آسمان کا رنگ سیاہ ہونے لگا اور جب دونوں

میںجا۔ اس کے ساتھ تین شکاری بھی کر دیے تاکہ ان جانوروں کے
 قدموں کے نشانات کی شناخت کر سکیں۔ یہ شخص جنگل کا چپہ چپہ جاتا
 تھا۔ جب وہ آدمی واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ اس میں کوئی شبہ
 نہیں کہ گینڈوں کے قدموں کے نشان جبر دزم جوہر کے ارد گرد
 منو خود ہیں اور بھاری بھر کم ہونے کی وجہ سے گینڈوں کے قدموں
 کے نشان بھیسوں کے قدموں سے زیادہ زمین میں دھنسے ہوئے ہیں۔
 ڈیٹ جی کے والد نے ایک رپورٹ بنا کر ضلعی اور صوبائی حکومت کو
 ارسال کی اور تین دن کے اندر اندر دائرے اور سرکاری افسران
 گینڈے کے شکار کے لیے پہنچ گئے۔ مالک نے ارد گرد کے دیہات
 کے کھیا طلب کر لیے اور ان عزت مآب مہمانوں کے آگے آگے
 شکاریوں، ہانکے والوں اور سامان اٹھانے والوں کی فوج بھی آگئی۔

صبح کے وقت جب سب اکٹھے ہو گئے تو یہ قافلہ جنگل کی طرف
 چلا۔ سرکاری افسران گھوڑوں پر سوار تھے، پیچھے پیچھے گاؤں کے لوگ
 پیدل روانہ تھے۔ انہوں نے بھالے، نیزے اور بانس سے بنے
 ڈھول اٹھا رکھے تھے۔ قلی کھانے کا سامان اور بستر وغیرہ اٹھائے
 ہوئے تھے۔ دانتے تھے، ان کے واحد ہتھیار ان کی مچپس تھیں جن
 سے کھانا بنانے کے لیے انہوں نے آگ جلائی تھی۔ آپ کو بتا ہے
 دوسرے جانوروں کے شکار سے گینڈوں کا شکار مختلف ہوتا ہے۔ آپ
 کو جنگل میں جا کر مختلف کام کرنے پڑتے ہیں، آپ کے پاس کم از کم
 تین چار دن کا کھانا کا سامان ہونا چاہیے۔ لہذا ہمارے پاس بھی
 چاروں کی بوریاں اساک میں محفوظ تھیں۔

اور میں نے کہا: "پاس کیا تھا؟" میں نے سوانا کو کہانی کے
 درمیان نوکا تو اس نے کہا: "کچھ نہیں، صرف مالک کی ہندوق اور
 کچھ گولیاں۔"

"تو تمہارے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا؟" میں نے سوال کیا
 تو سوانا نے بتایا کہ مالک کے پاس اس کے ذاتی ملازم تھے جو
 کھانا بناتے تھے اور مالک کا زخم دل تھا کہ وہ انہیں کھانے میں
 بہت کچھ دیتے دیتا تھا۔ وہ سوانا اور مادہ اپنی کہانی سناتے تھے
 معروف ہو گیا۔

ابھی صبح ہی بنی تھی کہ ہم جنگل میں پہنچ گئے۔ کوئی آہستہ آہستہ
 تیز رہی تھی۔ ہم نے تاریں چھوڑیاں بنانا شروع کر دیں جہاں

تک اس کے چہرے کی سرٹی اور اس کے خوف ناک دانت نہیں بھولے۔
 مہمانوں نے لوگوں کو چنی کر گیندوں کے نزدیک ہونے کو کہا۔ اتنی
 دیر تک شعلوں اور آگ میں نے ایک سیاہ دیوار بنالی تھی۔ جہاز یاں راکٹ
 میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ گیندوں کی چھٹی جس انہیں سمجھا چکی تھی کہ وہ
 خطرے میں ہیں۔ ان کے نکلنے کا راستہ شمال کی طرف تھا لیکن حیرانی
 کی بات تھی وہ اڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے انہیں پتا
 چل گیا ہو کہ وہاں شکاری گھات لگائے بیٹھے ہیں اور جیسے وہ جنوب و
 مغرب کی سمت بھاگنے کی تیاری میں ہوں۔ اس وقت تقریباً ساڑھے
 پانچ بج چکے تھے۔ اسی وقت ایک دھول کی آواز ہوا میں گونجی جسے سن
 کر گیندوں نے گویا ایک جہر جھری لی اور مغرب کی طرف بھاگا۔ اس
 نے لوگوں کی موجودگی کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ پھر ایک دندہ دو چنگھارا
 جیسے وہ اپنی مادر اور بچے کو بلا رہا ہو۔ دقتوں ایک قطار میں بھاگے
 گئے۔ بچے ان دونوں کے درمیان میں تھا اور وہ لوگوں کے چم سے
 راست بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ لوگ بھونچکا رہ گئے۔ کئی لوگ ان
 سے بچنے کے لیے زمین پر گرے ہوئے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میرا
 دماغ بھی ماؤف ہو گیا۔ میں بھاگ کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ ایک
 شاخ کے ساتھ مضبوطی سے پٹ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے

سمت سے گلی آگ نے اڑا دیا اور ہٹا کر نے والوں کا تھیرا تک
 دوتے کو تو اپنا تکہ ایک رائفل کی گولی کی آواز فضا میں گونجی۔ ایک
 درست کی شان پر دلی تمام کر بیٹھے رہتا، انصوسی طور پر جب وہ درخت سے
 دھڑک رہا ہو، بڑا دل گردے کا کام ہے۔ میں نیچے اتر آیا اور شور مچانے
 والوں میں شریک ہو گیا۔ ہمیں جلتی فضا میں بھی گیندے اپنی طرف
 آتے محسوس ہو رہے تھے۔ ایک بھوم ٹنگ جگہ پر کھڑا ہو کر شور مچا رہا
 تھا۔ اس جگہ پر پھوسے پھوسے درخت اور فنی جہاز یاں تھیں۔ گیندے
 اپنا تکہ شرق کی طرف سے سموارا دوتے اور ایسے جگہ رہا تھا جیسے سرک
 بنانے والے بلند اڑ بھاگ رہے ہوں۔

لوگ گیندوں کو دیکھ کر بے اختیار چلا رہے تھے۔ گیندے مغرب
 کی طرف چلے گئے۔ دو تین تھے ایک نر، ایک مادہ اور ایک بچہ، جب
 انہوں نے دیکھا کہ بھوم انہیں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے تو وہ والوں
 شرق کی طرف مڑے جہاں سے وہ آئے تھے۔ پھر وہ جنگل کے
 کنارے پرزے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ آگ سے خائف ہیں۔ دھوئیں
 سے سانس بند ہو رہا تھا، لہذا وہ دوبارہ مغرب کی طرف مڑے لیکن
 لوگ اُدھر بھی ان کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ آخر راستہ بھولنے والوں
 کی طرح وہ میدان میں کھڑے ہو گئے۔ زکام نہ کھاتا تھا اور میں آج



ہوئے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اب ان کا پتہ چھوڑ کر رہا ہے سو رہے، رات کے نو بجے ہم گھر واپس آئے۔ لے روانہ ہوئے اور سفر کر کے گھر پہنچے تو صبح الٹا لٹا ہوئی تھیں۔ ان کی ٹیکہ فیس اٹھالے کے باوجود ہم خالی ہاتھ لوٹے تھے۔ مارے راستے واپسی پر میں جب بھی کسی کالی چیز کو حرکت کرتے دیکھتا، مجھے وہ گینڈا ہی لگتا اور میرا کلیجہ منہ کو آتا۔

"سوانا! معلوم ہوتا ہے تمہاری قسمت بھی میری طرح خراب ہے۔" میں نے سوانا کو کہا۔ میں نے گینڈے کے سائز کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ بہت بڑا تھا۔ ایک جنگلی بھیڑیے سے بھی بڑا، وہ دس فٹ لمبا ہوگا۔ اس کی گردن بہت بھاری تھی۔ سر پر کوئی بال نہیں تھا۔ لمبی ٹھوٹھی، سناٹا ہوا بیٹنگ اور اس کی آنکھوں کو دیکھنے سے خوف طاری ہوتا تھا۔

پھر مہو نے پوچھا کہ اس کے دانت کیسے تھے؟ میں نہیں جانتا میں نے انہیں صحیح طرح نہیں دیکھا۔ اس کے دانت سڑکی طرح تھے مگر ان سے کہیں بڑے اور خوف ناک۔ "سوانا نے پھر پھر لیتے ہوئے کہا۔

"اور پھر؟" مہو نے پھر پوچھا۔ "وہ چھوٹا تھا جیسے ایک جوان بھینس ہوتی ہے۔" میں زندگی میں کئی دفعہ گینڈے کے شکار پر گیا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد مجھے کبھی گینڈے کے شکار کی پیش کش ہوئی تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ سوانا نے فیصلہ کن انداز میں کہانی کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اگ رہا تھا گینڈے بالکل میرے نیچے کھڑے ہیں اور زور زور سے ہانپ رہے ہیں۔ پھر مجھ پر جیسے غنودگی سی طاری ہو گئی اور میرے ہاتھ سے درخت کی شاخ اٹھ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں گینڈے کی پیٹھ پر بیٹھ گیا ہوں لیکن دراصل میں لایہیام کے اوپر گرا تھا جو مجھ سے نیچے درخت سے لڑکا ہوا تھا اور وہ لایہیام ہی تھا جس کے ہانپنے کی آواز میں سن رہا تھا۔ میرے گرنے سے لایہیام نے شور مچا دیا کہ اس کی کڑکھوٹ مٹی ہے۔ دوسرے لوگ بھی ابتنے ہی خوف زدہ تھے جتنا کہ میں۔ لایہیام اچھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے سنا کہ اچھ میں موجود کئی سو اڑس کا پیشاب کپڑوں میں بھی لکھ گیا تھا اور اب شکاری تھے جو سب سے تیز بھاگ کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ ایک سرکاری ملازم جو علاقے میں بڑا دلیر مشہور تھا اس سے کہنے لگا کہ گینڈے اس کی طرف آ رہے ہیں اس نے اپنی رائفل ایک طرف پھینکی اور بھاگ کر قریبی درخت پر چڑھ گیا۔ لوگوں نے شور مچایا کہ رائفل تو لے لو مگر اس نے کہا کہ اسے ضرورت نہیں ہے، اگر کسی کو چاہے تو وہ لے سکتا ہے۔ گینڈوں کا خاندان ملک بھرک حاکم ہو چکا تھا۔ سب درختوں سے نیچے اتر آئے اور اکٹھے ہو گئے۔ اب جب کہ گینڈے زور چاہتے تھے، کبھی اپنی بہادری کے قصے سنانے میں مصروف تھے۔ ہم واپس میں کب میں آ گئے۔

واتس رائے بہت شرمندہ تھے۔ انہوں نے ذمہ دارانے کے ذریعے لوگوں کو جانوروں کے نزدیک ہونے کو کہا تھا جس سے گینڈے سے بچا

گینڈے کے گھروں کے نام

حیدرآباد، رحیم یار خان۔ ہمایوں اسلم چوہدری، قصور۔ عاتق صدیقہ، خوشاب۔ شیریں شاہ، حیدرآباد۔ اہل علی، اوکاڑہ۔ محمد حمزہ، مقصود، لاہور۔ شہباز، چوہدری، گوجرانوالہ۔ عثمان غنی، فرزند علی، لاہور۔ حارث نعیم، لاہور۔ طلحہ سہیل، اسلام آباد۔ عافیہ سلمان، کراچی۔ خالد جیہ، ماہ نور، فیصل آباد۔ محمد باسط خان، میانوالی۔ کشف طاہر، لاہور۔ حمید شریف صدیقی، ہرولہ۔ حافظہ محمد منیب، وزیر آباد۔ حاطب بن اویس، راول پنڈی۔ سلمان منزل، لاہور۔ شمرن عظیم، اسلام آباد۔ محمد فرحان، واہ کینٹ۔ حسن بشیر، سیال کوٹ۔ حماد علی کاوش، شیخوپورہ۔ اربیدہ فاطمہ، ستیانہ، بنگلہ۔ المراح اکبر، لاہور۔ صفورہ فاقب، واہ کینٹ۔ رمشا، کنول، چک جھمرہ، سی۔ محمد صادق علی، کوٹری۔ سعیدۃ النساء، علی حمزہ، بھٹہ، راول پنڈی۔ سومنہ ذوالفقار، بہاول پور۔ حفصہ ارشد، پشاور۔ اربیدہ ذوالقرنین، بہاول پور۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ ندا خان، پشاور۔ عمار یاسر، لاہور۔ زویا احمد، گوجرانوالہ۔ رابیکا شاہد شیخ، گوجرانوالہ۔ سادیہ سعد، لاہور۔ گل ہما، سرگودھا۔ امجد علی، گجرات۔ ثوبیہ انوار، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ مظہر حسین، کوہرہ۔ طلعت ایوب، کوٹری۔ سلمان سعید، تربیلا۔ ام سلمہ، میانوالی۔ تورا کینٹ، جہلم، لاہور۔ ربیعہ نورین، فیصل آباد۔ طاہرہ، ڈنگہ۔ صائمہ لہری، کراچی۔ سحر نذیر، کوٹہ۔ دلشاد تازہ، بھیرہ۔ ذیشان سعید، سرگودھا۔ آفاق احمد، گجرات۔ صوبیہ یونس، فیصل آباد۔ انوار خالد، کراچی۔ ناہیدہ کوثر، پشاور۔ راجہ اشفاق احمد، راول پنڈی۔ ماہ نور، شاہ کوٹ۔ عاتق انور، اسلام آباد۔ عیسیٰ خان، ایبٹ آباد۔ محمد جاوید اسماعیل، سیال کوٹ۔ الیاس حیدر، گجرات۔ محمد رحیمان، بٹ، جہلم۔ محمد حارث، سعید، پنڈی، بہنیاں۔ شمیم حیدر، ملتان۔ فاطمہ محمود، خانیوال۔ شہزاد طارق، کراچی۔ ینش اکرم، واہ کینٹ۔ احسن سعید، کراچی۔ اظہر باغی، دربار آباد۔

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب کیجئے۔
عنوان جیتنے کی آخری تاریخ 10 جولائی 2014ء ہے۔

بالاعنوان



جون 2014ء کے "بالاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، ان میں سے مجلس ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، ان عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔



- ▶ حکومت نے نہ نئی عوامی فرما داروں سے جو کر لی تھی چرائیوں
- ▶ قربان ہاؤس نقل و حرکت، لواشیف سے چھوڑا اور ورزش بھی جاری
- ▶ یہ ہے بہت لمبی، جتنی بہت اناجین۔
- ▶ ہماری بے قصوری نقل و حرکت کے ساتھ ہی ہونا کی سیانی
- ▶ پانچویں پیدل و عوامی کوڈر ہمارا۔
- (محمد سابق علی کوری)
- (فکر و شش، ہیر)
- (محمد اسد سلیم، قصور)
- (جونی، علی، ہیر)
- (محمد قمر، بن، خوشاب)